قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون ۱۹۵۸ء

قیمت : بارہ آنے

شائع کردہ :-

ادارۂ طلوع اسلام

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
غیر ممالک سے: ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام
25/B گل برگ کالونی۔ لاہور

جلد ۱۱ — جون ۱۹۵۸ء — نمبر ۶

فہرست مضامین:

لمعات		۳
پیش کش برائے لغات القرآن		۷
سلیم کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۹
اسلام کا زرعی نظام	(محترم محمد تقی امینی)	۱۷
مجلس اقبال		۴۶
حقائق و عبر		۵۳
باب المراسلات		۵۷
نقد و نظر		۶۵
کراچی سے لاہور	(محترم پرویز صاحب)	۷۱
رابطۂ باہمی		۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انتخابات کے متعلق ابھی تک کوئی سرکاری اعلان ایسا نہیں ہوا جس میں تقینی طور پر کہا گیا ہو کہ یہ فلاں ماہ میں ہوں گے یا (کم از کم) مستقبل قریب میں بالضرور ہوں گے، لیکن الیکشن کا بخار ہے کہ وہ سال گذشتہ کے وبائی انفلوئنزا کی طرح سارے ملک میں پھیل گیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ دورِ حاضر کے جمہوری (ڈیماکریٹیک) اندازِ حکومت میں انتخابات کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہر جمہوری ملک الیکشن کی تیاری میں خاص سرگرمی دکھاتا ہے۔ لیکن دیگر ممالک اور ہمارے ملک کی سرگرمی میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں یہ سرگرمیاں سیاسی پارٹیوں تک یا ان افراد تک محدود ہیں جنھوں نے الیکشن لڑنا ہے۔ عوام اس سے بالکل غیر متعلق (Indifferent) نظر آتے ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے امیدواروں کی جو فہرستیں شائع ہوئی ہیں، عوام نے ان کے متعلق اتنا پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کہاں رکھی ہیں اور کس طرح دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اندازِ حکومت جمہوری ہو، انتخابات کے متعلق عوام کی طرف سے یہ ردِ عمل بڑا تاسف انگیز اور اندیشہ پرور ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے عوام، حکومت، کارپردازانِ مملکت اور خود لیڈروں کی طرف سے اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ ایسے اہم مسئلہ کے متعلق بھی ان کا ردِعمل یہی ہے کہ

ما را ازیں قصہ چہ؟ کہ گاؤ آمد و خر رفت

عوام کے ان تاثرات سے یہ خطرہ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے کہ آنے والے انتخابات کا فیصلہ باشندگانِ مملکت کی رضا کارانہ اور آزاد رائے دہندگی سے نہیں ہوگا۔ ان میں ووٹ <u>حاصل کئے جائیں گے</u>۔ اور ووٹ حاصل کرنے کے لئے جو طریقے بالعموم اختیار کئے جاتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کسی ملک کے پہلے الیکشن میں یہ صورتِ حالات، اس ملک کے مستقبل کے متعلق خوش آیند توقعات کے آئینہ دار نہیں ہو سکتی۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لیکن ان حالات کا رونا کیا۔ یہ تو تصدّاً اور ارادۃً پیدا کئے گئے ہیں۔ گذشتہ دس سال سے ہمارے راہ نمایانِ قوم اور سرآوردگانِ مملکت

کی مسلسل کوشش یہی رہی ہے کہ عوام کو ایسا شکستہ خاطر اور بددل کر دیا جائے کہ انہیں کاروبارِ مملکت سے کوئی دلچسپی نہ رہے اور اس طرح یہ ڈیماکریسی (یعنی عوام کی حکومت ان کے نمائندوں کے ذریعے) عوام سے یکسر بے تعلق، بلکہ ان کی طرف سے مامون و مصئون ہو کر، اپنی آمریت قائم رکھ سکیں۔ ان کی یہ کوششیں بڑی کامیاب رہی ہیں اس لئے آیندہ الیکشن ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں پیدا کر سکتا۔ الیکشن کی سرگرمیاں مختلف پارٹیوں کی باہمی رسہ کشی (یا جنگ زرگری) ہے۔ اپنے حسنِ کارکردگی کی بنا پر عوام کی نمائندگی حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں۔

لیکن ان حالات کے باوجود ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا شعور بیدار ہو چکا ہے اور وہ الیکشن کی اہمیت اور اپنی رائے کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ وہ احباب ہیں جن کی طرف سے ہمیں استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ الیکشن میں ان کا موقف کیا ہونا چاہیئے۔ اور رائے کے استعمال کا معیار کیا۔ یہ سطور انہی حضرات کے استفسارات کے جواب میں سمجھئے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس کشتی میں ہم سوار ہیں اس کی سلامتی اور صحیح منزل کی طرف اس کے رُخ کے تعین سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے ناخدایانِ کشتی کے انتخاب و تقرر کے مسئلہ سے ہمارا غیر متعلق رہنا خودکشی کے مرادف ہوگا۔ ہمیں اس میں گہری دلچسپی لینی چاہیئے۔ جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے، قارئین اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کی نہ اپنی پارٹی یا فرقہ ہے اور نہ ہی یہ کسی پارٹی (یا مذہبی فرقہ) سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس نے فلاں پارٹی کی تائید کرنی ہے اور باقیوں کی مخالفت۔ نہ ہی طلوعِ اسلام نے خود الیکشن لڑنا ہے جو یہ ایسی بات کہے جس سے اسے فائدہ پہنچتا ہو۔ اس کا اصول اور مسلک یہ ہے کہ ہر مسئلہ پیش آمدہ کا عقل و بصیرت اور تقاضائے زمانہ کی روشنی میں بجز یہ قرآن کریم سے حل تلاش کیا جائے۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہو نہ کسی کے خلاف تعصب۔ قرآن کی بارگاہ سے جو فیصلہ ملے اسے بلاکم و کاست پیش کر دیا جائے خواہ وہ کسی کے حق میں جائے یا کسی کے خلاف۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (۴/۱۳۵)۔ "خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے۔ یا تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے۔ خواہ وہ امیر ہو خواہ غریب۔ ان کے مقابلہ میں اللہ کا حق فائق ہے"۔

ایک اسلامی نظام میں (یعنی اس نظامِ مملکت میں جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہو) سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقوں کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر اس میں انتخاب ہوگا تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا کہ کس پارٹی کی تائید کی جائے اور کس کی مخالفت۔ نہ ہی اس میں مختلف پارٹیوں کے منشورِ انتخابات (Election Manifistos) کا کوئی سوال ہوگا۔ اسلامی مملکت میں ایک ہی منشور (مینی فیسٹو) ہوتا ہے۔ یعنی کتاب اللہ۔ اس نظام میں صرف افراد بہ حیثیت "امیدوار" سامنے آئیں گے۔ ان امیدواروں کی (Qualifications) وہ ہونگی جنہیں قرآن نے مومنین کی صفات یا اہلِ جنت کی خصوصیات قرار دیا ہے اور جن کی تفاصیل قرآن کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل امیدوار، کہ بہ حیثیتِ عمل، مختلف مدارج ہوں گے (وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا) اس معیار کے مطابق جس کا درجہ بلند ہوگا وہ جماعتِ مومنین کا صحیح نمائندہ ہوگا۔

لیکن یہ آئیڈیل (مثالی) نظام کی باتیں ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف پارٹیاں ہیں جن میں سے ہر پارٹی الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ان کے علاوہ، کچھ افراد ہوں گے جو "آزاد" امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ پارٹیاں ہوں یا افراد ان کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہوں گی۔ ایک ان کا منشور (مینی فیسٹو) اور دوسرے ان کا سابقہ کردار۔ منشور، درحقیقت ایک وعدہ ہوتا ہے جو متعلقہ پارٹی رائے دہندگان کے ساتھ کرتی ہے۔ یعنی وہ ان سے کہتی ہے کہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہمیں منتخب کر لیا تو ہم فلاں فلاں مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کریں گے۔ اگر ملک کا سابقہ تجربہ یہ بتاتا کہ پارٹیوں کے یہ وعدے الفہ فریبی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے، تو ہم کہہ سکتے تھے کہ مختلف جماعتوں کے مناشیر کو معیارِ ترجیح قرار دے لینا چاہیئے۔ لیکن جو کچھ قوم کے ساتھ گذشتہ دس سال میں ہوا ہے اس کے پیشِ نظر ان وعدوں پر اعتبار کر لینا خود فریبی ہوگی۔ کسی پارٹی کے پیش کردہ منشور کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کا سابقہ کردار، اس کا اعمالنامہ، اس کے متعلق کیا شہادت دیتا ہے۔ یہی صورت، کم و بیش، افراد (یعنی آزاد امیدواروں) کے سلسلہ میں ہوگی۔

یوں تو تمام مسائلِ زندگی اپنا اپنا مقام اور اہمیت رکھتے ہیں لیکن ہمارے زمانہ میں معاشی مسئلہ نے جو اہمیت حاصل کر رکھی ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ علاوہ دورِ حاضر کے اضافی تقاضوں کے، یہ مسئلہ بجائے خویش اتنا اہم ہے کہ قرآن کریم نے اسے خاص طور پر درخورِ توجہ سمجھا اور اس کے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان نے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے اس اسٹیج (سفرِ ارض) پر جس قدر پارٹ ادا کرنا ہے اس میں جسمانی توانائی اور طبیعی قوتوں کی تسخیر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس مرکب (سواری) کے بغیر یہ راستہ حسن و خوبی سے طے نہیں ہو سکتا۔ ان بنیادی یا اضافی تقاضوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دنیا کی مختلف قومیں اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ یہی وہ طعمہ ہے جس کی کشش سے بڑی بڑی اقوام چھوٹی قوموں کو اپنے دامِ سیاست میں پھنساتی اور اس طرح انہیں اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتی ہیں۔ پاکستان کے لئے یہ سوال اس درجہ شدید، سنگین اور نازک ہو چکا ہے کہ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کی موت و حیات کا فیصلہ اس مسئلہ پر موقوف ہے۔ قارئین طلوع اسلام کے سامنے یہ حقیقت بار بار آ چکی ہے کہ (از روئے قرآن) اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل مل نہیں سکتا جب تک رزق کے سرچشمے (وسائلِ پیداوار) افراد کی ملکیت سے نکل کر ملت کی تحویل (انتظام) میں نہ آ جائیں اور پیداوار کی تقسیم قرآنی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔

معاشی مسئلہ کا ایک حل کمیونزم پیش کرتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لئے وہ حل کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایک بھوکا، بھوک سے مر جائے گا لیکن زہر آلود کھانا نہیں کھائے گا، اسی طرح ایک مسلمان اس روٹی کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا جس کے کھانے سے، شرفِ انسانیت، (ارتقائے ذات) پر ذرا سا بھی اثر پڑے۔ روٹی تو ایک طرف، وہ یہاں تک کہہ دے گا کہ

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
بہ ایں قیمت نمی ارزم حیاتِ جاودانی را

دوسری طرف ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ہے جو اوّل تو اس مسئلہ کو نہ صرف ناقابلِ التفات بلکہ، نفرت انگیز قرار دیتا ہے

اور اگر اسے لب کشائی کرنی پڑے تو اس نظام سرمایہ داری کو اسلام کے مطابق بتاتا ہے جسے اب دنیا خود چھوڑے جارہی ہے، وہ غریبوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ تمہارے لئے یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے اور امیروں کو کھلی چھٹی دیدیتا ہے کہ وہ جس قدر دولت جی چاہے جمع کریں اور جتنی زمینیں چاہیں اپنے گھیرے میں لے لیں۔

لہٰذا اس باب میں کمیونسٹ اور قدامت پرست مذہبی طبقہ دونوں مرفوع القلم قرار پا جاتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں میں سب سے پہلے مسلم لیگ سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زمینداروں۔ جاگیرداروں۔ کارخانہ داروں کی جماعت ہے جس نے اپنے سابقہ کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس نظام سرمایہ داری کی علمبردار ہے جو (اور تو اور خود) ان ممالک میں جو اس نظام کے سلسلہ میں ان کے امام ہیں، متروک ہی نہیں بلکہ ملعون قرار پا چکا ہے۔ عوام کے لئے ان سے خیر کی توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے؟

ری پبلیکن پارٹی اور مسلم لیگ خالہ زاد بہنیں ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اس پارٹی کے ممتاز لیڈر ملک فیروز خاں نون صاحب نے بھی اگلے دنوں فرمایا ہے کہ بلا معاوضہ کسی سے زمین نہیں لے جاسکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ملک کی تمام بڑی بڑی اراضیات کا معاوضہ ادا کرنا مملکت پاکستان کے لئے قیامت تک بھی ممکن نہیں ہوگا۔

عوامی لیگ کے سہروردی صاحب نے گذشتہ ماہ ملتان میں (ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا کہ زمینداری اور جاگیرداری درحقیقت ملک کی معاشی زندگی کا سب سے بڑا صحت مندانہ جزو ہے اور اسے ختم کر دینے سے ملک میں ابتری پھیل جائے گی اور اس کا تمام معاشی نظام اصل و بنیاد سے اکھڑ جائے گا۔

جماعت اسلامی کی پوزیشن ان سب میں مضحکہ انگیز اور منافقت آمیز ہے۔ اس جماعت کے امیر (سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) بہ صراحت لکھ چکے ہیں کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اس پر کسی قسم کی حد بندی عائد کر سکے۔ ان کی کتاب (زمین کا مسئلہ) ان کے اس مسلک کی زندہ شہادت موجود ہے۔ لیکن اب وہ اس کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ

> جماعت اسلامی نے ملک میں زمینداریوں کی جانچ پڑتال کی اور اس امر کا جائزہ لیا کہ یہ زمینیں شروع میں کس طرح حاصل کی گئی تھیں۔ انھوں نے اس امر کی بھی تحقیق کی کہ ان میں سے کون کونسی زمینیں اسلامی قانون کی رُو سے ناجائز ہیں۔ ان کی تحقیق نے بتایا کہ ملک کی بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں سب ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی تھیں اس لئے انھیں بلا معاوضہ ضبط کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ان کا تھوڑا سا حصّہ ان لوگوں کے پاس حصولِ معاش کے لئے رہنے دینا چاہیئے۔ (پاکستان ٹائمز ۳؍ مئی ۲)

یعنی اسلام کی رُو سے زمینداریاں (بلا تحدید) باقی رکھی جاسکتی ہیں بشرطیکہ جماعت اسلامی اس امر کا فتویٰ دیدے کہ انھیں جائز طریق سے حاصل کیا گیا ہے۔ مقصد ظاہر ہے کہ کاشتکار بھی ان کے ساتھ رہیں اور زمیندار بھی اُن کے دست نگر! اور یہ سب کچھ "خدا و رسولؐ" کے نام کی آڑ میں!! ہمارا خیال ہے کہ ملک اب ان کے ان ہتھکنڈوں سے کافی واقف ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ چودھری محمد علی صاحب کی پارٹی ہے جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی نظام اسلام پارٹی میں مدغم ہو گئی۔ چودھری صاحب کی شخصیت بڑی دلچسپ ہے۔ یہ حصولِ پاکستان (بلکہ اس سے بھی پہلے سے) لیکر کل تک حکومت کی مشینری کے بڑے (اور آخری ایام میں) سب سے اہم پرزے تھے۔ سکریٹری جنرل۔ وزیر مالیات اور وزیر اعظم۔ اس سے زیادہ کلیدی پوزیشن اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس تمام دوران میں جب یہ مسند حکومت پر فائز تھے ملک میں ہر طرح سے خیریت تھی۔ خیریت ہی نہیں، ملک کا ایک ایک قدم خوشحالیوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن (اس کے بعد) جب انھیں ایوانِ حکومت سے نکال دیا گیا تو اب اُن کا فتویٰ یہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ (یعنی جو ان کے بعد باقی رہ گیا ہے) سب کا سب گولی مار دینے کے قابل ہے کیونکہ اس نے ملک کو تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ یعنی ملک کو تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دینے میں چودھری صاحب کا کوئی حصہ نہیں۔ اس کے واحد ذمہ دار وہ ہیں جو پیچھے رہ گئے ہیں۔

اور ان تباہیوں کا علاج؟ علاج یہ کہ آئندہ الیکشن میں چودھری صاحب کو منتخب کر لیا جائے! ہمیں چودھری صاحب کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جس شخص کا دس سالہ "خدمت گذاری" کا ریکارڈ ایسا ہو جس کی وہ خود ہی قدم قدم پر سخت ترین مذمت کرتا ہو (چودھری صاحب کا پاکستان کی موجودہ حالت کی مذمت کرنا ان کا خود اپنے آپ کی مذمت کرنا ہے) اور وزارت سے برطرفگی کے ایک ہی دھچکے نے جس شخص کی ذہنی اور نفسیاتی حالت یہاں تک پہنچا دی ہو کہ اسے اتنا بھی احساس نہ ہو کہ دنیا اُس کی باتوں پر کس طرح ہنستی ہے، اس کے ہاتھ میں قوم کی تقدیریں سونپ دینا۔ قوم کے ساتھ کونسی ہمدردی ہوگی؟

یہ ہے مختصر الفاظ میں ملک کی بڑی بڑی پارٹیوں کا مؤقف اور سابقہ کردار۔ اس وقت تک (غالباً) ان میں سے کسی کا انتخابی منشور شائع نہیں ہوا اس لئے ہم ان پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کر سکتے۔ اسے ہم آئندہ صحبت پر اٹھا رکھتے ہیں (جب ان کے مناشیر سامنے آجائیں) اِس وقت ہم اپنے قارئین سے صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کا انتخابی تعاون اس جماعت یا اس فرد کے ساتھ ہونا چاہیئے جو اس کا اعلان کرے کہ وہ (کم از کم) ملک کے معاشی مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس حل کی وضاحت کرے اور اس کا وعدہ کرے کہ وہ اسے عملاً نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اور اس کا سابقہ کردار اس کے اس دعوے کی تکذیب نہ کرتا ہو۔ یاد رکھئے۔ آئندہ انتخابات میں کامیاب ہونے والے اراکین وہ ہوں گے جن کے زمانے میں پاکستان کے نئے قوانین مرتب ہوں گے۔ اگرچہ لاکمیشن کی موجودہ رفتار سے تو یہی نظر آتا ہے کہ حکومت نے محض اشک شوئی کے لئے اس کا تقرر کر دیا ہے (اس کی ابھی تک دوسری میٹنگ ہی نہیں ہوئی) لیکن اس نے اگر کچھ کام کیا تو اس کی سفارشات مجلس قانون ساز کے سامنے جائیں گی۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ نہایت ضروری ہے کہ آئندہ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ وہ لوگ کامیاب ہوں جو پاکستانی قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر رکھنے کا تہیہ کریں۔ طلوع اسلام کی تائید انہی حضرات کے ساتھ ہوگی۔ سردست ہم اس اختصار پر اکتفا کرتے ہیں تفصیل آئندہ۔

پیش کش

برائے طباعت لغات القرآن

ہمارا انداز یہ چلا آ رہا ہے کہ ہم ہر پرچہ میں معطیان کی پوری کی پوری فہرست شائع کر دیتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نے کس قدر عطیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس میں سے کس قدر ادا ہو چکا اور کس قدر بقایا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ عدم گنجائش کے باعث اس مرتبہ ہم تفصیلی فہرست نہیں شائع کر سکے بلکہ صرف ان رقوم کو درج کر رہے ہیں جو پچھلی فہرست شائع ہونے کے بعد وصول ہوئی ہیں۔ سابقہ فہرست میں ۲۵ مارچ تک کی رقوم آ چکی تھیں اور کل میزان حسب ذیل تھی۔

(۱) منجانب بزم ہائے طلوع اسلام۔	۱۲،۳۱۶/-/- روپے
(۲) انفرادی	۱۵،۰۷۴/۸/۰
میزان	۲۷،۳۹۰/۸/۰

۲۶-۳-۵۸ تا بابت ۲۴-۵-۵۸

(۱) بزموں کی طرف سے

لاڑکانہ	۲۵—۰—۰
ڈیرہ غازی خان	۵۰—۰—۰
لائل پور	۲۵۰—۰—۰
پشاور	۳۴۰—۰—۰
واہ چھاؤنی	۱۰۰—۰—۰
اوکاڑہ	۱۰۰—۰—۰

(۲) انفرادی پیش کش

محترم روشن خان (کراچی)	۲۰۰۰—۰—۰
محترم ڈاکٹر رضا محمد خان (مردان)	۲۰۰—۰—۰
محترم عبد الحفیظ (کراچی)	۲۰۰—۰—۰
محترم منصور احمد جبلہ (کراچی)	۲۵۰۰—۰—۰
محترم اکرام اللہ خان (دہران)	۱۰۰—۰—۰
محترم محمد سعید (سیالکوٹ)	۵۰۰—۰—۰

کویت	۲۳۵—۰—۰	محترم عبدالحق (کراچی)	۵—۰—۰
میزان	۱۱۰۰—۰—۰	محترم شہاب الدین (کراچی)	۵۰—۰—۰

میزان ۵۵۵۵—۰—۰

	بیرونی	انفرادی	
میزان ہر دو رقوم	۱۱۰۰—۰—۰	۵۵۵۵—۰—۰	= ۶,۶۵۵—۰—۰
سابقہ میزان	۱۲۳۱۶—۰—۰	۱۵۰۷۴—۸—۰	= ۲۷,۳۹۰—۸—۰
میزان کل تا ۲۲ مئی ۵۸ء	۱۳,۴۱۶—۰—۰	۲۰,۶۲۹—۸—۰	۳۴,۰۴۵—۸—۰

نوٹ:- دفتر کے کراچی سے لاہور منتقل ہونے کی وجہ سے ڈاک اور دیگر انتظامات میں ابتری سی رہی ہے۔ احباب سے درخواست ہے کہ وہ اس فہرست کو چیک کرلیں اور اگر حساب فہمی میں کوئی غلطی ہو تو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی گلبرگ کالونی۔ لاہور

مکرر:- کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ جھنگ سے محترم میر تجمل حسین صاحب کا خط مع مبلغ پانچسو روپے وصول ہوئے۔ (جیسا کہ سابقہ فہرستوں میں شائع ہوتا رہا ہے) میر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ جب ان کے مقدمہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو وہ اس مد میں ایک ہزار روپیہ دیں گے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ تو ہو گیا لیکن اٹھارہ ہزار کے دعوے میں سے صرف سات ہزار سات سو روپے کے قریب وصول ہوئے۔ اس لئے وہ ایک ہزار کی بجائے پانچ صد روپیہ ادا کر رہے ہیں۔ ہم ان کے حسن معاملہ کو درخور تحسین سمجھتے ہیں کیونکہ حساب کے مطابق یہ رقم پانچ صد سے کم ہی بیٹھتی تھی۔

ایک معذرت ادارہ کی نقل مکانی کی وجہ سے ڈاک در نظم ونسق میں ابتری سی رہی ہے۔ اگر آپ کے کسی خط کا جواب نہ دیا گیا ہو۔ یا کسی ارشاد کی تعمیل نہ ہوئی ہو۔ یا حساب میں غلط فہمی ہو تو ہماری معذرت قبول فرمایئے اور ایک خط لکھ دیجئے۔

ایک تاکید اگر آپ کو مہینے کی دس تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ اگر آپ کی طرف سے پندرہ تاریخ تک اطلاع نہ ملی تو پھر آپ کو پرچہ نہیں مل سکے گا۔ فاضل پرچے بہت کم رہتے ہیں۔

ایک یادداشت ادارہ کا دفتر 25-B گلبرگ کالونی (لاہور) میں واقع ہے۔ خود تشریف لانے والے احباب شہر سے کینال بنک کی نہر پر آجائیں۔ ایف سی کالج والے پل سے نہر کو پار کرکے سیدھی سڑک پر چلے جائیں۔ تھوڑی دور چل کر پانی کی ٹنکی کے ساتھ نو تعمیر مکان میں ادارہ کا دفتر ہے۔ اسی جگہ محترم پرویز صاحب کا درس قرآن ہوگا۔ وسط جون سے ہر اتوار کی صبح تشریف لائیے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

سلیم کے نام

قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ

سلیم میاں! تمہارا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ لیکن میری حالت ابھی تک یہ ہے، گویا آج ہی گاڑی سے اترا ہوں۔ جو سامان کراچی میں دو ہفتے میں باندھا تھا اسے کھولتے کھولتے ایک مہینہ لگ گیا اور ابھی تک کئی ڈھیر لگے ہیں جو ریاض خیرآبادی کے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی طرح) اسی طرح سامنے رکھے ہیں۔ پھر تماشا یہ کہ "جو گر ہیں وہاں ہاتھوں سے دی تھیں وہ یہاں دانتوں سے کھولنی پڑ رہی ہیںؔ" سوچو کہ

میں کہاں اور یہ وبال کہاںؒ

ان حالات میں تمہارے خط کا مفصل جواب کس طرح لکھ سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ تم نے بات ایسی چھیڑی ہے جو بڑی اہم (بلکہ بنیادی) ہے اس لئے اسے زیادہ وقت تک التوا میں رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ لہٰذا سر دست نہایت مختصر الفاظ میں اس کا جواب لکھتا ہوں۔ تفصیل کبھی فرصت میں سہی۔

تم کہتے یہ ہو کہ اگر امت خالص قرآن کی طرف آگئی تو اس سے اختلافات اور بڑھ جائیں گے۔ انفرادی طور پر، ہر شخص کی تعبیر جداگانہ ہوگی اور اجتماعی طور پر (یوں سمجھئے کہ) ہر ملک میں قانون شریعت مختلف ہوگا —— پاکستان میں کچھ، افغانستان میں کچھ۔ ایران

ؔ ریاض کا شعر ہے۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

ؒ یہ پنجابی کے ایک محاورہ کا ترجمہ ہے۔ دیوں سمجھو کہ) لاہور کی ہوا کا پہلا اثر۔

ہیں کچھ اور ترکی ہیں کچھ۔ اس سے بہتر ہے کہ اُمت فرقوں میں بٹی رہے۔ کم از کم ایک فرقے میں تو اتحاد اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ مختصراً تم کہتے یہ ہو کہ خالص قرآن کو ضابطۂ زندگی بنانے سے اُمت میں اختلاف و انتشار اور زیادہ ہوگا۔

ذرا سوچو سلیم! کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ یعنی

(۱) ہم مسلمان ہیں اور قرآن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

(۲) اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام نوع انسانی کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے۔

(۳) اس کا یہ بھی دعوے ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

(۴) ہم دنیا سے کہتے ہیں کہ قرآن کے ان دعاوی کے سچا ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔

(۵) اور اس کے ساتھ ہی ہم اس کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر ہم نے قرآن کو زندگی کا ضابطہ اور راہ نما قرار دے لیا تو اس سے ہمارے اختلافات اور بڑھ جائیں گے

سلیم: کوئی اور ہوتا تو اسے شاید مجھے تفصیل سے بتانا پڑتا کہ ہماری یہ پوزیشن، دنیائے علم و بصیرت میں کس قدر تاسف انگیز ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ لیکن تمہارے لئے۔ میرے خیال میں یہ مختصر سا تجزیہ اور تبصرہ ہی کافی ہوگا۔

سوچو سلیم کہ کیا ایمان اسی کو کہتے ہیں؟ لیکن اس میں تمہارا کیا قصور! اس کتاب کے متعلق (جیسے علامہ اقبال "مجید مظلوم" کہا کرتے تھے اور ایسا کہنے میں بالکل حق بجانب تھے) ہم صدیوں سے صرف اتنا ہی کہتے اور سنتے نہیں چلے آرہے کہ اس کی طرف آنے سے اُمت میں اختلافات بڑھیں گے، بلکہ اس کے علاوہ وہ کچھ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اگر کسی عام مصنف کی کتاب کے متعلق بھی ایسا کچھ کہہ دیا جائے تو وہ اپنا سر پیٹ لے۔ غور سے سنو کہ اس کتاب عظیم کے متعلق ہمیں کیا بتایا جاتا ہے؟ یہ بتایا جاتا ہے کہ

(۱) اس کتاب (قرآن) میں بعید اختلافات ہیں اور وہ اختلافات ایسے نہیں کہ غور و فکر سے ان میں مطابقت کی صورت پیدا کی جا سکے۔ وہ ایسے بنیادی۔ گہرے اور شدید ہیں کہ ہر متضاد صورت میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان دو آیات میں سے ایک آیت منسوخ ہے۔ منسوخ کے معنی یہ ہیں کہ وہ آیت ویسے تو قرآن میں موجود ہے لیکن اسے فی الحقیقت قلمزد سمجھنا چاہیئے۔

ذرا غور کرو سلیم! اگر کوئی مصنف اپنی ایسی کتاب شائع کر دے جس میں بے حد متضاد باتیں ہوں تو اس کتاب اور اس کے مصنف کے متعلق دنیا کیا کہے گی؟ "تضاد" تو تصنیف کا ایسا نقص ہے کہ اگر کسی کتاب میں دو باتیں بھی باہدگر متضاد ہوں تو علمی طبقہ میں اس کتاب کا کوئی وقار ہی نہیں رہتا۔

لیکن ہم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب (اور آخری کتاب) کے متعلق فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ تضادات سے بھری ہوئی ہے اور جب تک اس کی سینکڑوں آیات کو منسوخ نہ مانا جائے اس کے تضادات کے رفع ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں پیدا ہو سکتی۔

یا العجب۔

(۲) اس کتاب عظیم کے متعلق ہمارا ایمان یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی ربط نہیں یونہی منتشر سے خیالات کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ ابھی آدم کا قصہ شروع تھا کہ اس میں سے گائے ذبح کرنے کی بات نکل آئی۔ وہ داستان ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ جنگ کے احکام شروع ہو گئے۔ ابھی ہم میدانِ کارزار میں تھے کہ نکاح وطلاق کے مسائل کا آغاز ہو گیا۔ انہی مسائل میں یہاں وہاں عاد و ثمود کا ذکر آتا رہا۔ غرضیکہ نہ (معاذ اللہ) ایک آیت سے دوسری آیت کا ربط ہے نہ ایک سورت کے مضمون کا دوسری صورت کے مضمون سے کوئی علاقہ۔

یہ ہے اس کتاب کے متعلق ہمارا دوسرا عقیدہ۔ ذرا سوچو سلیم! اگر کسی کتاب کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بڑی غیر مربوط ہے، تو اس کتاب کی علمی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ پھر تماشا یہ ۔۔۔ کہ اس کتاب کے متعلق ہمارا دلی عقیدہ تو یہ ہے اور زبانی اقرار یہ کہ یہ منزل من اللہ ہے ۔۔۔ ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

(۳) اس کتاب کے متعلق ہمارا (زبانی) ایمان یہ بھی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق کامل راہ نمائی ملتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) بڑی ناقص اور نامکمل ہے۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں جامع اور مکمل راہ نمائی ملتی ہو۔

ایک ہی کتاب کے متعلق وہ ایمان اور یہ اعلان ۔۔۔ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے!

(۴) اس کتاب کے متعلق ہم یہ بھی بانگِ دہل کہتے ہیں کہ یہ بڑی مبہم اور غیر واضح ہے۔ اس میں کوئی بات صاف صاف طور پر بیان نہیں کی گئی۔ اگرچہ زبان سے ہم اس کا بھی اقرار کرتے رہتے ہیں کہ یہ کتابٌ مبین ہے۔ اس میں نہ کوئی پیچ ہے نہ خم۔ نہ الجھاؤ ہے نہ گنجلک۔ لیکن یہ اقرار صرف زبان تک محدود رہتا ہے۔ دل میں ہمارے یہی عقیدہ راسخ ہے کہ یہ بڑی مبہم و غیر واضح ہے۔ اور اس عقیدہ کا اعلان بڑے فخر سے کیا جاتا ہے۔

(۵) نیز یہ کہ یہ کتاب بڑی مشکل ہے۔ یہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی (الا ماشاء اللہ)، کوئی کہتا ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے اٹھارہ علوم کی تحصیل کی ضرورت ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے کہ ان علوم کے حصول کے بعد بھی یہ خدا کے خاص بندوں کی سمجھ میں آسکتی ہے (بلکہ "آسکتی تھی" کیونکہ اس کے سمجھنے کا دور ختم ہو چکا ہے)۔ اس تخصیص نے یہاں تک شدت اختیار کی کہ ایک گروہ نے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ اس کے سمجھنے کیلئے "نبی" کی ضرورت ہے۔ غیر از نبی اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ انہی میں سے دوسرے گروہ نے کہا کہ نبی تو نہیں۔ البتہ اسے "مجدد" ضرور ہونا چاہیئے۔ یعنی جب تک کسی شخص کو خدا براہ راست نہ سمجھائے اس کی کتاب کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتی۔

یہ ہے مختصراً ہمارا عقیدہ (رسخۃ راسخہ۔ یقینِ محکم) اس کتاب کے متعلق جسے ہم خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ یعنی

(۱) اس سے اختلافات بڑھتے ہیں۔

(۲) اس میں بکثرت ایسی باتیں ہیں جو باہدگر متضاد ہیں اور ان کا تضاد مٹ نہیں سکتا جب تک ان میں سے ایک حصّہ کو منسوخ نہ مانا جائے۔

(۳) اس میں کوئی ربط نہیں۔

(۴) یہ ناممکل ہے اس میں کسی بات کے متعلق پوری پوری ہدایات نہیں ملتیں۔

(۵) یہ مبہم اور غیر واضح ہے۔

(۶) یہ بعید شکل اور ناقابل فہم ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم زبان سے یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ یہ کتاب بے مثل و بے نظیر ہے اور ساری دنیا مل کر بھی اس جیسی کتاب مرتب نہیں کر سکتی۔

ایک بات بالکل واضح ہے۔ اگر یہ کتاب بے مثل و بے نظیر ہے تو اس میں ان نقائص میں سے کوئی ایک نقص (بلکہ اس کا شائبہ تک بھی نہیں ہو سکتا) جنہیں ہم اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اور اگر (معاذ اللہ) اس کتاب میں وہ نقائص فی الواقعہ موجود ہیں تو ایسی کتاب، اللہ تعالیٰ کی تو ایک طرف، (خاکم بدہن) کسی اچھے مصنف (انسان) کی بھی نہیں ہو سکتی۔

لیکن تماشا یہ ہے کہ ہم صدیوں سے اسے بھی مانتے چلے آرہے ہیں اور اُسے بھی۔ حالانکہ (اور نہیں تو کم از کم) علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ یا ہم اُسے مانتے یا اِسے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کے بے مثل و بے نظیر ہونے کا ایمان، صرف ہماری زبانوں تک رہتا ہے۔ عملاً اس کے متعلق ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ اس میں (معاذ اللہ) وہ تمام نقائص موجود ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

اب تم سوچو سلیم! کہ جس قوم میں صدیوں سے یہ عقیدہ متوارث و متواتر چلا آرہا ہو کہ یہ کتاب تضادات سے بھرپور ہے۔ اس سے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں ربط نہیں۔ یہ ناممکل ہے۔ غیر واضح اور مبہم ہے اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ جب اس قوم کے افراد کے سامنے اس کتاب کا ذکر کیا جائے گا تو ان کا پہلا ردِ عمل (First Reaction) یہ ہوگا کہ اس کتاب سے جتنا دور رہا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس سے ہماری کسی مشکل کا حل تو ملے گا نہیں۔ تشتت و انتشار اور اختلاف و افتراق اور بڑھ جائے گا۔ چنانچہ تم نے جو کہا ہے کہ اگر اُمّت قرآن کی طرف آگئی تو اس سے اختلافات اور بڑھ جائیں گے، یہ (غیر شعوری طور پر) وہی پہلا ردِ عمل (First Reaction) ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہ ردِ عمل اس پراپیگنڈہ کا نتیجہ ہے جو اُمّت کو اس کتاب سے دور رکھنے کے لئے مسلسل و متواتر کیا گیا۔ اور نہایت کامیابی سے کیا گیا۔ اس کامیابی سے کہ اُمّت زبان سے تو اس کتاب کو بے مثل و بے نظیر کہتی رہی۔ لیکن عملاً اس کے متعلق یہ عقیدہ راسخ کر لیا۔ یہ اسے جھوم جھوم کر پڑھتی بھی رہی اور اس سے دور بھی ہٹتی چلی گئی۔ یہ اسے خدا کی کتاب بھی کہتی رہی اور اس میں ان نقائص و اسقام کو

بھی تسلیم کرتی رہی جن میں سے اگر کسی ایک نقص کے متعلق بھی کہہ دیا جائے کہ وہ ان میں سے کسی کتاب میں موجود ہے تو وہ تھگے پڑ جائے۔

اب تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس کتاب (قرآن کریم) کے متعلق میں نے اس عقیدہ کو کیسے بدلا؟ میری اس تبدیلی کی داستان بڑی طول طویل ہے۔ لیکن اس مقام پر میں تمہیں ایک فقرہ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی جس میں اس کتاب کے متعلق وہی عقیدہ فضا میں پھیلا ہوا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ چنانچہ عمر کے ایک حصہ تک میں بھی اسی عقیدہ کا حامی تھا۔ اور بڑا پُرجوش حامی۔ میں بھی اپنے ہم عصروں کی طرح خارج از قرآن نظریات و تصورات کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے قرآن کو اسی قسم کی کتاب ثابت کرنے کو صحیح اسلامی خدمت سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جب میری زندگی کا دوسرا دور آیا جس میں میں نے اپنے عقائد پر تنقیدی نگاہ ڈالنا شروع کی تو سب سے پہلے یہی بات میرے سامنے آئی کہ جو کتاب اس قسم کے نقائص سے بھرپور ہو وہ (معاذ اللہ) خدا کی کتاب کیسے ہو سکتی ہے؟ چونکہ اس کتاب کے متعلق بچپن سے یہ عقیدہ راسخ ہو چکا تھا کہ یہ ہے ہی ایسی۔ اور اس میں غور و فکر کرنے کے تصور کو بھی ابلیسی وسوسہ بتایا جاتا تھا۔ اس لئے سلیم!......

(میں یہ کچھ لکھ رہا ہوں اور میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے)

میرے سامنے اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا کہ میں قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے (معاذ اللہ) انکار کر دیتا۔

میں ایسا ضرور کر دیتا اگر اس مقام پر ایک بے پناہ قوت مجھے تھام نہ لیتی۔ میں نے "بے پناہ" کا لفظ یونہی مبالغہ کے لئے نہیں لکھ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں ریب و تشکیک کی وادیوں سے گذر کر جس تیزی سے انکار و سرکشی کے حدود میں داخل ہو چکا تھا، وہاں سے مجھے تھام لینا کسی عام قوت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس مقام پر مجھے کوئی بے پناہ قوت ہی تھام سکتی تھی۔ وہ بے پناہ قوت کونسی تھی جس نے مجھے اس طرح جہنم میں گرنے سے بچا لیا۔

سنو سلیم۔ اور غور سے سنو! وہ بے پناہ قوت تھی۔ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی سے میرا بے پناہ "عشق"۔ عشق کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا مطالعہ میرے لئے شروع ہی سے انتہائی ذوق کی چیز تھی۔ یوں کہو کہ یہ میرا خاص موضوع تھا۔ اس مطالعہ نے مجھے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت تک پہنچا دیا تھا کہ حضورؐ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر فائز ہیں جنہیں "معراج انسانیت" سے کم کوئی تصور سامنے نہیں لا سکتا۔ اس سیرت و کردار کی پیکر شخصیتؐ میرے لئے زندگی کا ماڈل (اسوۂ حسنہ) بن چکی تھی جس کا عکس اپنے اندر پیدا کرنا میرے نزدیک مقصودِ حیات تھا۔ اس عظیم ترین مقصد کے حصول کی تڑپ کو میں "عشق" سے تعبیر کرتا ہوں۔

بہر حال، نبی اکرمؐ کی سیرت و کردار کی عظمت وہ بے پناہ قوت تھی جس نے مجھے جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔ حضورؐ

کی صداقت و دیانت پر میرا ایمان تھا۔ میں دل کے پورے اطمینان کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس قسم کا انسان نہ فریب خوردہ ہو سکتا ہے نہ (معاذ اللہ) فریب کار۔ لہٰذا جب میں اس بات پر غور کرتا کہ نبی اکرمؐ جیسی شخصیت نے کہا ہے کہ قرآن منجانب اللہ ہے تو میرا دل بلا تامل پکار اٹھتا کہ یہ کتاب یقیناً منجانب اللہ ہوگی۔ اور جو کتاب منجانب اللہ ہو اس میں کسی قسم کے اسقام و تناقض نہیں ہو سکتے۔ جنھیں خود میں بھی اپنی کسی کتاب میں پسند نہ کروں۔ "عشق و زیرکی" کے اس امتزاج نے قرآن کے متعلق میرے (First reaction) کو یکسر بدل دیا۔ اب میرا ردِ عمل یہ تھا کہ ہو نہیں سکتا کہ اس کتابِ عظیم میں کوئی تضاد و تخالف ہو۔ ہو نہیں سکتا کہ اس میں ربط نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ ناقص و نا تمام اور مبہم اور غیر واضح ہو۔ یا یہ سمجھ میں نہ آ سکے۔

ردِ عمل یا زاویۂ نگاہ کی اس تبدیلی نے اس کتابِ عظیم کے لئے میرے دل میں نئے ولولے بیدار کر دیئے۔ میں نے تہیہ کیا کہ اسے سمجھنا چاہیئے اور اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اس کے ایک ایک دعوے کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت یقین پیدا ہو جائے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے (خود قرآن سے) یہ متعین کیا کہ یہ اپنے سمجھنے کا طریق کیا بتاتا ہے۔ پھر اس طریق کے مطابق اس پر غور و فکر شروع کیا۔ جوں جوں غور کرتا آگے بڑھتا گیا، قرآن کا ایک ایک دعویٰ حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتا چلا گیا۔ اور آج (بتوفیق ایزدی) میں پورے وثوق اور اطمینان سے کہہ سکتا (اور سمجھنے والے کو سمجھا سکتا) ہوں کہ یہ ایسی بے مثل و بے نظیر کتاب ہے جس کی مانند ساری دنیا مل کر ایک آیت بھی نہیں بنا سکتی۔ اس کا ایک ایک دعویٰ ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔ یہ روشنی کے مینار کی طرح جگمگاتی ہوئی کتاب مبین، خود بھی واضح ہے اور دنیا کے ہر مسئلہ (problem) کا حل نہایت واضح طریق پر سامنے لے آتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے آسان اور عمل کرنے کے لئے بڑی سہل ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے اپنے اندر کہیں اختلاف و تضاد کا شائبہ تک نہیں بلکہ یہ تمام نوعِ انسانی کے اختلافات کو مٹا کر انھیں امتِ واحدہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج عدالتِ خداوندی کی میز پر یہی کتاب ہے جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کے فیصلے ہوتے ہیں۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اب میری ساری کوششوں کا منتہیٰ یہ ہے کہ خدائے عظیم و جلیل کی اس کتابِ عظیم و جلیل کو اس طرح واضح طور پر سامنے لایا جائے کہ (کم از کم) قوم کے نوجوان طبقہ کے دل میں اس کے متعلق (First Re-action) یہ پیدا ہو کہ یہ کتاب

خیز و طرحِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ (اقبالؒ)

(۱) ایسی ہے جس میں کوئی تضاد اور تخالف نہیں اور اس سے نہ صرف اُمتِ مسلمہ کے، بلکہ تمام نوعِ انسانی کے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔

(۲) اس کی آیات میں آسمان کے تاروں کی طرح باہمی ربط و ضبط ہے

(۳) یہ مکمل ہے اور تمام مسائلِ حیات (Problems of life) کا حل اپنے اندر رکھتی ہے۔

(۴) یہ صاف اور واضح ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں۔

(۵) یہ ہر انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور جو شخص اسے اس کے بتلائے ہوئے قاعدوں کے مطابق سمجھنا چاہے اس کے سامنے اپنے حقائق کو بے نقاب کر کے رکھ دیتی ہے۔

جب اس کتاب کے متعلق اس کا یہ ردِعمل یا تاثر ہو گا تو وہ اس پر غور و فکر بھی کرے گا۔ اور جب وہ اس میں تدبر و تفکر سے کام لے گا تو اس کے ہر دعوے پر علی وجہ البصیرت ایمان لاتا چلا جائے گا۔

یہ ہے عزیزم! میری کوششوں کا مقصود۔ اگر یہ حقیر سی کوششیں کسی حد تک بھی بارآور ہو گئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے انسانیت کی تقدیریں بدلنے کے لئے کچھ (contribute) نذر کیا۔

اب رہا تمہارا یہ سوال کہ قرآن کے متعلق ایسا ردِعمل یا تاثر (impression) پیدا کرنے والوں کی اس قدر شدید مخالفت کیوں ہوتی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مخالفت کرنے والے اس کتاب عظیم کے متعلق بعد از تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں جس کا وہ اعلان کرتے رہتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انھوں نے اپنے لئے کچھ ارباب من دون اللہ (خدا سے ورے کچھ معبود) تجویز کر رکھے ہیں۔ اگر قرآن کو نوعِ انسانی کے لئے واحد۔ مکمل۔ واضح۔ مربوط ضابطۂ حیات مان لیا جائے جس سے تمام اختلافات مٹ سکتے ہیں، تو اس سے ان کے معبودوں پر زد پڑتی ہے۔ ان معبودوں کی عظمت کو قائم رکھنے کا طریق یہی ہے کہ قرآن کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اس کے متعلق دلوں میں (First Reaction) یہ پیدا ہو کہ یہ (معاذ اللہ) ایک بیکار سی چیز ہے۔

اس ردِعمل (Reaction) کا مٹانا اور اس کی جگہ صحیح (reaction) پیدا کرنا بنیادی کام ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا پہلا مظاہرہ (First Reaction) کی شکل میں سامنے آیا کرتا ہے۔ جس قسم کا (Reaction) اسی قسم کا ایمان۔ جس طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص کے متعلق تمہارا (Reaction) تو یہ ہو کہ وہ بڑا بددیانت ہے اور تم اس پر اعتماد بھی کر لو۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک کتاب کے متعلق تمہارا (Reaction) یہ ہو کہ اس سے نہ امت کے اختلافات مٹ سکتے ہیں نہ یہ کسی معاملہ کا مکمل حل پیش کر سکتی ہے نہ یہ واضح اور صاف بات کر سکتی ہے۔ نہ کسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کتاب کے متعلق یہ ایمان بھی رکھو کہ یہ دنیا کی بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ یہ نفسیاتی ناممکنات (Psychological Impossibilities)

یں رہے ہے۔ لہٰذا قرآن کے متعلق زاویہ نگاہ کا بدلنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً اس وقت ہم نہایت بے باکی سے یہ کہہ دیتے ہیں صاحب! کسی مسئلہ کے متعلق دس اشخاص سے کہئیے کہ وہ قرآنی حل بتائیں۔ ان میں سے ہر ایک کا جواب مختلف ہوگا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی

(۱) قرآن کتاب ہی ایسی ہے کہ اس میں سے ہر شخص کو اس کی منشار کے مطابق جواب مل سکتا ہے۔

(۲) قرآن سے متضاد جواب نہیں مل سکتے۔ اس لئے ان لوگوں کے طریق فکر و استدلال کا نقص ہے جو یہ متضاد نتائج پر پہنچے ہیں۔

اس وقت ہم (عام طور پر) پہلی بات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہم عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ قرآن سے ان مسائل کا حل طلب ہی نہ کیا جائے۔ اگر قرآن کے متعلق ہمارا زاویہ نگاہ بدل جائے تو ہم باصرار کہیں گے کہ قرآن سے ایک مسئلہ کے دو متضاد جواب مل نہیں سکتے۔ یہ ناممکن ہے۔ قطعاً ناممکن۔ لہٰذا یہ حضرات اگر مختلف نتائج پر پہنچے ہیں تو ان کے طریق فکر و استخراج نتائج میں غلطی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ غلطی کہاں ہے۔ جب ہم قرآن کی روشنی میں) اس سوال پر غور کریں گے تو قرآن خود بتا دے گا کہ ان محققین کی فکری غلطی کیا تھی۔ جب اس غلطی کو رفع کرنے کے بعد ہم پھر غور کریں گے تو یقیناً ایک نتیجہ پر پہنچیں گے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ یہی ہے، اور اس کا ہر دعویٰ سچا ہے۔

زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے یہ ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ تم اس اصولی بات پر غور کرو جو باتیں وضاحت طلب ہوں انہیں دوبارہ پوچھ لو۔ اس طرح امید ہے تمہاری یہ الجھن دور ہو جائے گی۔ والسلام

پرویز

۲۵-بی گلبرگ کالونی۔ لاہور — ۲۰ مئی ۱۹۵۸ء

لاہور میں دفتر کا پتہ

کینال پارک والی نہر پر آپ سیدھے ایف۔سی۔ کالج کے پل پر آجائیے۔ وہاں سے نہر پار کر کے دو تین فرلانگ سیدھی سڑک پر چلے آئیے۔ وہاں پانی کی اونچی ٹینکی کے ساتھ

25/B گل برگ مل جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔

اسلام کا زرعی نظام

(محترم محمد تقی امینی - ناگپور)

قرآن کریم کی رُو سے زمین کی حیثیت کیا ہے' اس عنوان پر طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے قارئین کے سامنے یہ حقیقت واضح طور پر آ چکی ہے کہ زمین نوعِ انسانی کے لئے ذریعۂ رزق ہے اس لئے اس پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآنی مملکت کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی ابتدائی ضروریاتِ زندگی فراہم کرے۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں اور معاشرہ ان کا جو انتظام مناسب سمجھے کرے۔ وہ چاہے تو قطعاتِ اراضی کو، مناسب شرائط پر مختلف افراد کو کاشت کے لئے دیدے اور چاہے تو اراضی کی کاشت اجتماعی طور پر کرلے۔ چاہے تو زمین کے کسی ٹکڑے کو نسلاً بعد نسلٍ کسی ایک ہی خاندان میں منتقل ہونے دے اور چاہے تو اسے اپنی تحویل میں لوٹا کر اس کا کوئی اور انتظام کرے۔ بہرحال' اس میں اختیار و اقتدار قرآنی معاشرہ کا ہوگا نہ کہ افراد کا زمین کی یہ وہ پوزیشن ہے جو قرآن سے واضح طور پر سامنے آتی ہے (تفصیل اس اجمال کی ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی)

اس ضمن میں اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہدِ رسالتمآب اور خلافتِ راشدہ میں زرعی نظام کس قسم کا تھا؟ اس سوال کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ چونکہ اس عہد سعادت عہد میں قرآن پر عمل ہوتا تھا اس لئے اُس میں زرعی نظام بھی بلا شک و شبہ قرآنی خطوط ہی پر ہوگا۔ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا باقی رہا یہ کہ اس نظام کی تفاصیل کیا تھیں تو اس باب میں حتم و یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ نے اپنے زمانے کی تاریخ مرتب کر کے اُمت کو نہیں دی۔ اس دور کی تاریخ بہت بعد میں جا کر مرتب ہوئی اور (جیسا کہ تاریخ میں ہوتا ہے) اس میں غلط اور صحیح ہر قسم کے واقعات درج ہوگئے۔ ہمارے نزدیک ان واقعات کی صحت و سقم کا معیار یہ ہے کہ جو واقعہ قرآن کی تعلیم اور منشاء کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو اسے غلط قرار دیا جائے' اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ان حضراتؓ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔

باایں ہمہ قارئین کی طرف سے اکثر یہ تقاضا ہوتا رہا کہ اس دور کے زرعی نظام کے متعلق جو کچھ بھی تاریخ میں ملتا ہے اسے طلوعِ اسلام میں ضرور پیش کیا جائے اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے اپنے طور پر تاریخی تحقیق کا کام شروع کیا۔ لیکن اس دوران میں ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب آگئی جس میں اس موضوع پر (اگرچہ جامع نہیں لیکن) اچھا خاصا سالہ (Material) جمع کیا گیا ہے۔ قارئین کی بے تابی تمنا کے پیشِ نظر اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (کتاب مولوی محمد تقی امینی رناگپوری کی لکھی ہوئی اور ہندوستان سے شائع ہوئی ہے) آپ دیکھیں گے کہ اس دور کے زرعی نظام کا جو نقشہ بہ ہیئت مجموعی ہمارے سامنے آتا ہے وہ اسی قرآنی حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ زمین پر حق تصرف افراد کا نہیں بلکہ معاشرہ (یعنی قرآنی نظام) کا ہے اور اس باب میں حرفِ آخر وہی قانون ہے جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

لنا رقاب الارض زمینیں درحقیقت خلافت کی ہیں۔

اس مقالہ میں سب سے پہلے زمینداری اور جاگیرداری کا تاریخی پس منظر دیا گیا ہے اس کے بعد، اس پس منظر میں اس انسانیت ساز انقلاب کے خط و خال سامنے لائے گئے ہیں جو قرآن کی رُو سے منصۂ شہود پر آیا۔ اور آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو زمینیں اس وقت مسلمانوں کے پاس تھیں اُن کی صحیح پوزیشن کیا تھی۔ امید ہے قارئین اسے دلچسپ اور مفید پائیں گے (طلوعِ اسلام)

مستقل ملکیت کا تصور کس طرح قائم ہوا

ابتدائی زمانہ میں زمین تمام انسانوں کی ملکیت سمجھی جاتی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلی مرتبہ کسی زمین کو استعمال کرنا شروع کر دیتا اس پر اس کی عارضی ملکیت قائم ہو جاتی تھی اور یہ ملکیت اس وقت تک قائم رہتی جب تک اس پر اس کا قبضہ رہتا تھا۔ قبضہ کے ہوتے ہوئے اس کو بے دخل کر کے کسی دوسرے شخص کا قابض ہو جانا انصاف اور قانون فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ البتہ قبضہ باقی نہ رہنے کی صورت میں دوسرے شخص کو اس زمین کے استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔ چونکہ ایسے قبضہ کی صورت میں طاقت کا ہونا ضروری تھا اور اس بات کا قوی امکان رہتا تھا کہ اگر اس سے زیادہ طاقتور شخص کو یہ مقام پسند آگیا تو اس کو بے دخل کر کے وہ خود اس پر قبضہ کرے گا اس لئے اس عارضی ملکیت پر انسان زیادہ دنوں قناعت نہ کر سکا بلکہ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ہی مستقل ملکیت کا تصور قائم ہوا۔

پہلے تو صرف زمین استعمال کرنے کا حق تھا لیکن مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین کی ذات کی بنیاد پڑ گئی۔ ابتداءً قبضہ نے بلا شرکتِ غیرے ایک حق پیدا کیا تھا اگرچہ وہ عارضی تھا لیکن یہی حق بعد میں رفتہ رفتہ مستقل ملکیت کا سبب بن گیا۔ اس کے متعلق بلیک اسٹون کا یہی نظریہ ہے اور جرمنی کے مشہور مقنن سوگنی بھی تقریباً اسی رائے کا مؤید ہے۔ اہلِ روما میں جائیداد کا ابتدائی تصور یہی پایا جاتا ہے، اور جے۔ کے بلنچلی ایک حد تک اس کی تائید میں ہے[1]۔

---

[1] مقدمہ قانون فصل ہشتم ص ۲۰۳ و نظریۂ سلطنت ص ۲۶۲

مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین اور جائیداد کا مالک ایک شخص یا ایک خاندان نہ ہوتا تھا بلکہ اس زمانہ میں ہر سری خاندان کے نمونہ پر جو جماعتیں قائم تھیں وہی اس کی مالک ہوتی تھیں اور انہی کے ذمہ اس کا پورا انتظام ہوتا تھا۔ اس کے بعد ان جماعتوں کے مشترکہ حقوق سے رفتہ رفتہ شخصی حقوق علیحدہ ہوتے گئے اور بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ شخص واحد اس کا مالک سمجھا جانے لگا۔[1]

قانونِ اشخاص پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی ملکیت کی موجودہ شکل جو ہمارے سامنے ہے وہ جماعت کے مشترکہ حقوق سے شخصی حقوق کے علیحدہ ہو جانے سے پیدا ہوئی ہے اس طرح پر کہ خاندان بڑھ کر ایک جدی رشتہ داروں کا مجموعہ ہو جاتا ہے پھر یہ مجموعہ مختلف گھرانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور بالآخر گھرانوں کی جگہ اشخاص قائم ہو کر وہی مالک سمجھے جانے لگتے ہیں لیکن تبدیلی کے ہر مرحلہ پر ملکیت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

پہلے کاشتکار غلام ہوتے تھے

تاریخ کی ورق گردانی سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانہ کے مالکانِ زمین آزاد آسامیوں کے ذریعہ کاشت کرانے سے ناواقف تھے۔ اس زمانہ میں بالعموم غلاموں کی جماعتیں کاشت کیا کرتی تھیں اور اس کی شکل یہ تھی کہ ادنیٰ درجہ کے غلام چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر دیے جاتے اور انہیں اعلیٰ اور معتبر قسم کے غلاموں کی ماتحتی میں دے کر ان کی نگرانی میں وہ کاشتکاری کا کام انجام دیتے تھے۔ مدتوں کاشت کا یہی طریقہ جاری رہا اور اسی طرح غلاموں کی جماعت کاشت کرتی رہی۔

لیکن جب اس صورت میں بدنظمی حد سے بڑھ گئی اور زمینداروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب کاشتکاروں کی ذاتی اغراض کا تعلق پیداوار سے نہ ہوگا نہ زمین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ تو غلاموں کی جان بچنے کی یہ شکل پیدا ہوئی کہ بعض زمینداروں نے دوامی پٹہ اور مقررہ لگان پر آزاد آسامیوں کو زمین دینے کا طریقہ رائج کیا۔

اس احساس کو مزید تقویت پہنچانے والی یہ چیز بھی ہوئی کہ ایک ایک شخص کے پاس زمینیں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں جن کا انتظام بغیر مذکورہ شکل رائج کیے ہوئے سخت دشوار تھا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ روما میں تنہا ایک فرد کے پاس اتنی بڑی جائیدادوں کا ذکر ملتا ہے کہ جن کی کاشت خاندان کا سردار اپنے گھر کے لڑکوں اور غلاموں سے نہیں کرا سکتا تھا بلکہ وہ آزاد آسامیوں کے ذریعہ کاشت کرانے پر مجبور تھا۔

نظام محدود ملکیت کا قیام اور کاشتکار کے اختیارات

الغرض اس طریقے کے رائج ہو جانے کے بعد کاشتکاروں کی دو قسمیں ہو گئیں: (۱) غلام کاشتکار اور (۲) آزاد آسامی کاشتکار۔

ان نئے کاشتکاروں کے ساتھ زمین دینے کا یہ معاملہ پہلے تو معاہدہ کے ذریعہ طے ہوتا تھا لیکن جب بعد میں اس شکل کو زیادہ

---

[1] قدیم قانون فصل ہشتم ص ۲۰۳ و نظریۂ سلطنت ص ۲۰۲

ترقی ہوئی تو اس کے لئے ایک خاص اصطلاحی نام "محدود ملکیت" مقرر کر دیا گیا۔

اس محدود ملکیت کو بالخصوص روما میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ کاشتکاروں کو زمین کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے کا واحد ذریعہ یہی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور اس میں کاشتکاروں کو اتنے وسیع اختیارات ملنے لگے تھے کہ روما کے حکام کاشتکار ہی کو مالک سمجھتے تھے اور جب تک وہ وقت پر محصول ادا کرتے رہتے زمین کے مالک کو بھی کسی قسم کی مداخلت کرنے کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ البتہ محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں مالک کو بیدخل کر دینے کا اختیار حاصل تھا۔

اس بیدخلی کی صورت میں بھی کاشتکاروں کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ جائیداد غیر منقولہ پر دخلیابی کی نالش کر کے اس پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیں۔

یہ واضح رہے کہ کاشتکاروں کو اتنے اختیارات ملنے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ زمینداروں کی ملکیت اس زمین سے زائل ہو جاتی تھی یا ان کے اختیارات بالکلیہ سلب کر لئے جاتے تھے بلکہ اس قسم کی اراضی میں دوہری ملکیت کا اصول کارفرما تھا یعنی اگر کاشتکاروں کے اختیارات پر نظر کی جاتی تو یہ شبہ ہونے لگتا کہ زمین کے اصل مالک کاشتکار ہیں اور زمیندار کی حیثیت برائے نام ہے۔ اور اگر ان اختیارات پر غور کیا جاتا جو زمینداروں کو حاصل ہوتے تھے تو حقیقی مالک وہ معلوم ہوتے اور کاشتکار کی حیثیت صرف آزاد کاشتکار کی ہوتی تھی۔

روما میں یہی دوہری ملکیت کا اصول ان زمینوں میں بھی پایا جاتا ہے جو سرحد کے فوجیوں کے پاس تھیں یہ سرحدی لوگ زمینوں پر بظاہر مالکانہ حیثیت سے قابض ہوتے تھے لیکن زمین حقیقتہً حکومت ہی کی رہتی تھی البتہ ان لوگوں کو جب تک یہ فوجی خدمت انجام دیتے رہتے اس زمین پر کاشت کرنے کی پوری اجازت ہوتی تھی۔ اور اس صورت میں ان کی فوجی خدمتیں معمولی درجہ کے محدود حقوق والے کاشتکاروں کے برابر سمجھی جاتی تھیں۔

نظام محدود ملکیت کی بگڑی ہوئی شکل جاگیری نظام کی بنیاد ہے

محققین و مورخین کی نظر میں یہی محدود ملکیت کی شکل اصل اور بنیاد قرار پائی ہے اور زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی تمام اچھی اور بُری شکلیں اسی سے پیدا ہوئی ہیں، مثلاً

(۱) حقوقِ استفادہ نے موروثی شکل اسی محدود ملکیت سے اختیار کی ہے کیونکہ اس طرح کی دی ہوئی تمام زمینیں عام طور پر آزاد آسامیوں کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جایا کرتی تھیں۔

(۲) انہی آزاد آسامیوں سے کھیت کو بٹائی پر دینے کا طریقہ رائج ہوا کیونکہ یہ لوگ اپنی سالانہ پیداوار کا ایک حصّہ زمین کے مالکوں کو نذر کیا کرتے تھے۔

(۳) غالباً کچھ غلاموں کی حیثیت میں ترقی اور کچھ آزاد آسامیوں کی حالت میں تنزلی سے رعایا کا درمیانی طبقہ پیدا ہوا ہے جو نہ تو غلام کاشتکار کی طرح مجبورِ محض اور بے بس ہوتا تھا اور نہ آزاد آسامیوں کی طرح اس کو پورے اختیارات حاصل تھے۔ یہ درمیانی

طبقہ اس وقت پیدا ہوا ہے جبکہ آزاد آسامیوں کو پہلے جیسے حقوق و مراعات نہ حاصل ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ زمینداروں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی تھی۔

(۴) اسی محدود ملکیت کے نظام کو دیکھ کر جاگیری نظام قائم کیا گیا جس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ غیر مہذب قوموں کے بادشاہ تقریباً سو سال تک اس بگڑی ہوئی شکل کا بغور مطالعہ کرتے رہے اور ان کو اس کے اندر کچھ ایسے جراثیم نظر آئے کہ وہ اس پر ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

ابتداء میں تو یہ جاگیر صرف بادشاہ کے مصاحبوں کو درباداری کے صلہ میں ملا کرتی تھی اور یہ لوگ اپنی ذاتی آزادی (جو خاندانی جائیداد کے مالکوں کا معزز ترین حق تھا) اس کے صلہ میں قربان کر دیا کرتے تھے لیکن بعد میں اس کا رواج عام ہو گیا اور نوبت بایں جارسید کہ اس نظام میں کاشتکار کی حیثیت زرعی غلام کی ہو گئی تھی اور ابتدائی زمانہ کے غلام کاشتکار اور ان نام نہاد آزاد کاشتکاروں میں کوئی زیادہ فرق باقی نہیں رہا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ جاگیرداری کی بالکل ابتدائی شکل جس میں جاگیر بادشاہ کے خاص مصاحبوں کو ملا کرتی تھی اگرچہ اس وقت بھی بظاہر نظر میں یہ خدمت بڑی شاندار معلوم ہوتی تھی لیکن اس سے ایک قسم کی غلامانہ ذلت کی بو آتی تھی کیونکہ اس کے عوض اپنی ذاتی آزادی کو قربان کرنا پڑتا تھا۔

الغرض اس طرح زمینداری اور جاگیرداری کی بنیاد پڑی اور اس کی شکلیں ساری دنیا میں پھیلیں۔ یہ ابتدائی تصورات دنیا کی کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہ تقریباً ہر قوم میں پائے جاتے تھے اور تمام رومی و یونانی دنیا میں رائج تھے۔ ان تصورات کے رواج پانے اور ان کی پیدائش کے اسباب میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہر جگہ اور ہر قوم میں یکساں حالات کے ماتحت ظاہر ہوئے اور ہر جگہ اسباب پیدائش بھی تقریب قریب ایک ہی تھے۔[۱]

زمینداری و جاگیرداری کا بھیانک منظر اور انسانی زندگی پر طبقاتی کشمکش کا اثر

اس کے بعد زمینداری و جاگیرداری نے یہاں تک ترقی پائی کہ اللہ کی زمین جو سب میں مشترک تھی اور جس کے مساویانہ حیثیت سے سب حقدار تھے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور کاشتکار کا طبقہ جبر و تحکم کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے لئے نہ آزاد کاشتکار جیسے حقوق باقی رہے اور نہ رعایا کے ابتدائی حقوق، بلکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی استعدادوں کو چھوڑ کر زرعی غلام میں تبدیل ہو گیا۔

ان دونوں طبقوں میں پہلے کو ہر طرح سے آزادی حاصل تھی اور دوسرا ہر حیثیت سے غلام و بے بس تھا۔ اس کو زمین چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت بھی نہ تھی اور نہ اپنی محنت سے منتفع ہونے کی سکت تھی، نہ آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید تھی۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی عجمیوں اور رومیوں کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

[۱] پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تدبیر تمدن منفس ہشتم ص ۱۹۶ تا ص ۲۴۲

"طبقہ امراء کے لئے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی بس یہ شکل باقی رہ گئی تھی کہ کاشتکاروں، تاجروں اور دیگر کاروباریوں سے بھاری بھاری لگان اور کثیر مقدار ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگیاں تنگ ہوگئی تھیں۔ اگر یہ لوگ اس سے انکار کرتے تو انھیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں اور اطاعت کرتے تو اتنی زیادہ محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی کہ ان کی زندگیاں گدھوں، بیلوں کی طرح ہو جاتیں۔

یہ بیچارے ہر وقت محنت و مشقت اور خدمت گذاری میں لگے رہتے تھے، انھیں اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنے دنیوی ذاتی مفاد کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ اور اُخروی سعادت کی طرف نظر اٹھانے کی توان میں بالکل ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا بسا اوقات ملک میں ایک شخص بھی نہ ہوتا کہ اس کو دین کی کچھ فکر ہو[1]۔"

یونان، روم، ایشیا وغیرہ کے حالات کا مختصر جائزہ

یونان اسی طبقاتی کشمکش میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی عام زندگی میں سکون اور سادگی کی جگہ عیش پرستی آگئی تھی اور سیاسی اقتدار شخصی آرزوؤں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا، انفرادیت کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا اور ریاست کی بنیاد مخصوص طبقہ کی اغراض پر رکھی جاتی تھی جس کی بناء پر امراء اور عوام کے درمیان زبردست خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں اور مظلوم عوام کی شورشوں کو ظالمانہ طور پر دبا دیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان کے گھروں کو جلانا۔ کھیتوں کو تباہ کرنا، قتل کرنا، غلام بنانا غرض ہر قسم کا وحشیانہ سلوک عوام اور کاشتکاروں کے ساتھ مباح سمجھا جاتا تھا[2]۔

روم بھی دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طبقہ ظالم تھا اور دوسرا مظلوم۔ پہلا ظلم کرنے کے لئے ہر طرح سے آزاد تھا، اور دوسرا ظلم سہنے کے لئے ہر طرح سے مجبور تھا۔ امراء روم کی ساری زندگی انہی کی محنت اور جفاکشی سے چل رہی تھی اور بیلوں کی طرح یہ لوگ دن رات کام میں جُتے رہتے تھے۔

بالعموم کاشتکار اور عوام کی زندگی بیلوں اور گدھوں جیسی ہو گئی تھی۔ حکام کے اختیارات غیر محدود تھے اور سزا دینے میں وہ ہر طرح سے آزاد تھے۔ ٹیکس وصول میں ہر قسم کی عبرتناک اور دردناک سزائیں دی جاتی تھیں[3]۔

اس میں شک نہیں کہ بعض فرمانروائے روم مثلاً آگسٹس وغیرہ نے اصلاحات کی کوششیں کی تھیں اور ان میں رعایا پروری کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے لیکن ان کی یہ کوششیں زیادہ دیرپا نہ ثابت ہو سکیں۔ کیونکہ جب پورا نظام ہی زہریلا ہو تو محض جزوی تبدیلی سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ سلطنت کے اجزاء میں نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار قائم ہو سکتا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جمہوریہ افلاطون مقالہ پنجم ص ۲۲۰ و ۲۵۰ اور ریاست ص ۵۱۸۔ مقدمہ ریاست ص ۲۸

[3] تاریخ زوال روما ج ۱ ص ۵۲، ۷۱، ۴۹ و ۹۰۔ درویتہ الکبریٰ۔ ص ۱۸ و ۱۹۔

ایشیا کی شخصی سلطنتوں کا حال بھی اس سے کم دردانگیز نہ تھا وہاں بھی عیش پرستی اور ظلم و تعدی کا بازار گرم تھا جس کی بنا پر حکومت و اقتدار کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی تھیں اور عوام پر سے حکومت کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو چکی تھی کہ حکام اور تحصیلدار بغیر فوجی طاقت کے اپنا پورا کام نہ کر پاتے تھے۔ حتیٰ کہ سلطنت کے مراکز بھی اس وبا سے محفوظ نہیں رہے تھے وہاں بھی ظلم و ستم کی چکی چل رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ جب سماج اس قسم کی طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو تو اس کا نتیجہ لازمی طور سے یہ ہوگا کہ لوگوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ اولوالعزمی اور بلند پروازی کے سرچشمے خشک ہو جائیں گے۔ لوگوں کو افکارِ عالیہ اور اخلاقِ حمیدہ سے نفرت ہونے لگے گی، اور جدتِ طبع ختم ہو کر کورانہ تقلید میں عافیت نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کہتے ہیں:

"جب یہ مشاغل زیادہ ہو جائیں گے، تو لوگوں میں خست و دناءت سرایت کر جائے گی اور وہ اعمالِ صالحہ و اخلاقِ فاضلہ سے اعراض کرنے لگیں گے۔"[۲]

اور مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن کہتا ہے:

یہ غیر ممکن تھا کہ اس زمانہ کے لوگ تن آسانیوں میں رہ کر زوال کے اسباب نہ دیکھتے رومی زندگی میں ایک زہریلا اثر سرایت کرنے لگا تھا، عقلمندی اور ہوشیاری کا کہیں پتہ اور نشان نہ تھا۔ شعراء اور مقررین کی لوگ غلامانہ تقلید کرتے تھے، جدتِ طبع ختم ہو چکی تھی اور ایسا تنزل تھا جس سے ان کے جذبات ذلیل و پست اور قویٰ پژمردہ ہو گئے تھے۔[۳]

اسلامی انقلاب اور اراضی خالصہ

الغرض یہی فضا اس وقت تقریباً تمام دنیا پر محیط تھی کہ اسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں امانت و عدالت، افادیت و رحمت اخوۃ و مساوات اور ایثار و قربانی کا پیغام لے کر وادی "غیر ذی زرع" سے نمودار ہوا۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی ہواؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ جو ملکیت کی آڑ میں جور و استبداد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔ اس نے ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم میں مذہب و ملت کا فرق کئے بغیر ضرورت و صلاحیت اور حسنِ عمل کے اصول کو ملحوظ رکھا۔ اور اپنے زمانہ کے زمیندارانہ و جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین کی ملکیت کا تصور نہیں بلکہ اس کے امانت ہونے کا تصور غالب تھا۔

زمانۂ خلافت میں قطائع صرف مفادِ عامہ کے پیشِ نظر دیئے جاتے تھے

چنانچہ خلافت ابتدائی میں ایک قسم ان اراضی کی ملتی ہے جو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو عربی زبان میں "قطائع"

---

[۱] تاریخ زوالِ روما [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ [۳] تاریخ زوالِ روما ج ۱ ص ۵۶

سکتے ہیں۔ اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس زمین پر کاشت کرتا تھا۔

(۲) اگر مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ کاشت کراتا تھا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ اس کو صرف زمین کی منفعت کا مالک بنا دیا جاتا اور ذاتِ زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا تھا۔ اس آخری صورت میں ہر قسم کے تصرفات بیع ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے تھے۔

لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے "قطائع" پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی اختیارات کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابیوں سے واپس لے لیا تھا۔ اور اس واپسی میں مفادِ عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ جس طرح رسول اللہ نے مفادِ عامہ کی خاطر "قطیعہ" دیا تھا اسی طرح حضرت عمرؓ نے اسی کے پیشِ نظر واپس لے لیا تھا۔ دراصل قطائع دینے اور ان کے واپس لینے دونوں میں مفادِ عامہ کی روح کام کر رہی تھی۔

اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانۂ خلافت کے "قطائع" کی اصل حقیقت واضح ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ بعد میں اس کی اصل حقیقت کس قدر مسخ ہوئی اور اب اس لفظ کو موجودہ زمینداری و جاگیرداری کی حمایت میں کس بری طرح آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔

زمانۂ خلافت کے قطائع کی اصلی شکل اور بعد کی بگڑی ہوئی شکل

خلافتِ الٰہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کو سامنے رکھ کر اُن کی یوں تعریف کی جا سکتی ہے۔ "مفادِ عامہ کی حفاظت کی خاطر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لئے کسی کو دینا اور حسبِ حاجت و مصلحت اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا"۔

مندرجہ ذیل تصریحات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اَلْاِقْطَاعُ اِعْطَاءُ الْاَرْضِ لِلْاَحْيَاءِ سَوَاءٌ وَجَبَ فِيْهِ الْعُشْرُ اَوِ الْخَرَاجُ[1]

"اقطاع کسی کو آباد کاری کے لئے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔"

علامہ مقریزیؒ اس سلسلہ میں کلامِ عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں:۔

اَقْطَعَهٗ نَهْرًا اَوْ اَرْضًا اَبَاحَ لَهٗ ذٰلِكَ

نہر یا زمین قطیعۃً "دیا۔ یعنی اس کے لئے مباح کر دیا۔

---

[1] فیض الباری للعلامہ انور الکشمیری ج ۳ ص ۲۰۸

علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری فرماتے ہیں :

"قطائع" قطیعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطائع دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں وہ اہلیت وصلاحیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصّہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کر دے اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے

(۲) یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے ذات کا نہیں[1]۔

قاضی ابوبکر بن علیؒ شارح ترمذی کہتے ہیں :۔

"اقطاع" ہبہ ہے جس میں ایک کا حصّہ دوسرے شرکاء سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اصولاً اراضی میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں[2]۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا بیان ہے :۔

وَ لِلسُّلْطَانِ اِقْطَاعُہٗ عَلَی الْمِلْكِ وَكَذَا عَلٰی غَیْرِہٖ[3]

خلیفہ کو قطائع دینا جائز ہے چاہے تو زمین کا مالک بنا دے اور چاہے تو مالک نہ بنائے (صرف انتفاع کا موقع دے)

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافتِ الٰہی میں "قطائع" کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ کسی شخص کو آباد کاری کے لئے خلافت کی جانب سے زمین دی جاتی تھی اور وہ زمین سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ ہوتی تھی بلکہ خلیفہ کے اختیارات اس پر بہ نسبت دیگر اراضی کے زیادہ ہوتے تھے۔ بعض متأخرین نے "قطائع" کی یہ تعریف کی ہے :۔

هُوَ تَمْلِيكُ الْأَرْضِ مَرْفُوعَةً عَنِ الْمُؤْنِ فَلَا يَكُوْنُ فِيهَا الْعُشْرُ أَوِ الْخَرَاجُ[4]

"قطائع" کسی کو زمین کا اس طرح مالک بنا دینا کہ اس پر ٹیکس وغیرہ نہ عشر کی صورت میں واجب ہو اور نہ خراج کی صورت میں۔

قطائع جن زمینوں سے دیئے جاتے تھے ان کی تفصیل

ظاہر ہے کہ "قطائع" کی یہ تعریف مذکورۂ بالا تعریفوں سے کتنی مختلف اور حقیقت سے کس قدر دور ہے، زمانۂ خلافت میں نہ اس قسم کی تنظیم کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ یہ مزاج اسلامی ہی کے موافق بیٹھتی ہے۔ اسلام تو دراصل اسی قسم کی زیادتیوں کو

---

[1] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۶ [2] ایضاً ص ۱۵۰۔ [3] فیض الباری [4] مسویٰ ص ۲۰۵ [5] فیض الباری ج ۳ ص ۳۰۸

ختم کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ ان کو باقی رکھنے اور رواج دینے کے لئے۔

قطائع جن زمینوں سے دیئے جاتے تھے اُن کی تفصیل

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی آراضی ایسی تھیں جو خلافت کی جانب سے لوگوں کو بطور "قطیعہ" دی جاتی تھیں۔

(۱) بنجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزروعہ اور غیر آباد چلی آتی تھی۔ ان کی ویرانی اور سختی دیکھ کر عام لوگوں کو انھیں قابل کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف توجہ کر کے انھیں قابل کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ "نقیع" میں جو زمین حضرت زبیرؓ کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی۔[1]

(۲) افتادہ زمین جس میں قابل زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے کاشت نہ ہوتی تھی اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بیکار پڑی رہتی تھیں اور انھیں کوئی آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں جو آبپاشی کی دشواری کی وجہ سے رسول اللہ کے حوالہ کر دی گئی تھیں اور ان کو آپ نے لوگوں میں زراعت کی خاطر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو رسول اللہ نے وادی عقیق اسی زمین سے عطا فرمائی تھی۔[2]

(۳) خالصہ زمین اس میں مفتوحہ علاقوں کی تمام وہ زمینیں شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لئے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی زمینوں کی کئی قسمیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

ا۔ جن زمینوں کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

ب۔ یا بھاگ جاتے

ج۔ شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرف خاص کے لئے "خالصہ" ہوتی تھیں۔

د۔ شاہی خاندان اور افسران کی جاگیریں۔

ہ۔ ترائی، جھیلیں، جھاڑیاں وغیرہ

یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلامی غلبہ کے بعد ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ ایسی تمام زمینیں خلافت کے لئے "خالصہ" ہو کر مفاد عامہ کے لئے وقف ہو جاتی تھیں۔[3]

ابو عبیدؒ "خالصہ" زمین کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

فَلَمْ یَبْقَ بِهَا سَاكِنٌ وَلَا لَهَا عَامِرٌ فَكَانَ حُكْمُهَا إِلَى الْإِمَامِ[4]

---

[1] الاحکام السلطانیہ ماوردی صفحہ ۱۸۳ [2] الاموال ابی عبید صفحہ ۲۸۲ [3] الاموال ص ۲۸۲ و الخراج ص ۵۷ و ۵۸ [4] الاموال ص ۲۸۲

مذکورہ خالصہ زمینوں میں نہ کوئی رہنے والا باقی رہتا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لیے ان کا معاملہ خلیفہ کے سپرد ہو جاتا تھا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں

وَ ذَالِكَ بِمَنْزِلَةِ الْمَالِ الَّذِىْ لَمْ يَكُنْ لِاَحَدٍ وَلَا فِىْ يَدِ اَحَدٍ[۱]

ایسی زمین کی حیثیت اس مال جیسی ہوتی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ خلافت میں انہی زمینوں سے "قطائع" دیئے جاتے تھے جو نہ تو کسی کے قبضہ میں ہوتیں اور نہ کوئی ان کا مالک اور وارث ہوتا۔ نہ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان ہوتا، اور نہ ایسی زمین ہوتی جو نا نوناً کسی کو نہ دی جا سکتی تھی مثلاً چراگاہ، جنگل، نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ ایسی صورت ہوتی جس میں کسی کے نقصان کا سوال پیدا ہوتا[۲]۔

ایسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں (۱) یا تو وہ بیکار پڑی رہتیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے رہتے (۲) اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی۔

خلافت نے نفع خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی تھی۔ یہ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ زمانہ خلافت میں تمام بنجر اُفتادہ زمینیں آباد ہو گئی تھیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلّہ اُگلنے لگا تھا۔

قطائع لوگوں کو مفاد عامہ کے پیش نظر دیئے جاتے تھے جب اس کی خلاف ورزی ہوتی یا کوئی اور عمدہ صورت سمجھ میں آتی تو واپس لے لئے جاتے تھے

حکومت الٰہی میں قطائع دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن اگر اس میں کوتاہی ہوتی یا اور کوئی عمدہ صورت اراضی کے تنظیم کی سامنے آتی جس میں نفع خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔

چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس و پیش اسی نظریہ کے ماتحت صاحب زمین کو بیدخل کر دیا گیا تھا۔ چند واقعات یہ ہیں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو پوری "وادی عقیق" دے دی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں لہٰذا جتنی زمین آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھیے اور بقیہ خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔

[۱] الخراج ص ۵۸ [۲] الخراج ص ۵۹ [۳] الاموال ص ۲۷۲، ۲۷۴

یہ سُن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصّہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی[۱]۔

اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ رسول اللہ کے قریب ترین صحابی تھے اور انھیں زمین کا عطیہ خود رسول اللہ نے عطا فرمایا تھا جس کی بنا پر اُس عطیہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ ہونا فطری بات تھی۔ مگر حضرت عمرؓ نے مفادِ عامہ کے لئے بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیا جائے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت الٰہی میں خلیفۃ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر بلال جیسے جلیل القدر صحابی سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر نااہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین یا اُن کی ضرورت سے زائد زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور اس میں حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" کیسے حائل بن سکتا ہے۔

(۲) رسول اللہ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی حضرت عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصّہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین لے لی تھی[۲]۔

(۳) قومِ بجیلہ کا واقعہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے خالصہ زمین کا کچھ حصّہ انھیں دے دیا تھا، اور دو تین سال تک وہ اس کو آباد کرتے رہے تھے لیکن جب خلقِ خدا کے نفع کی اس سے عمدہ صورت سمجھ میں آئی تو خلافت نے بلا پس و پیش وہ زمین ان لوگوں سے واپس لے لی تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا عام قانون کے ماتحت مسلمانوں کو زمین جائداد سے بیدخل کر کے ان کا وظیفہ مقرر کر دینا[۳] اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومت الٰہی میں قطائع دینے کا سلسلہ عام مفاد کے پیشِ نظر ہوتا تھا جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا قطائع باقی رکھے جاتے تھے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفعِ خلق زیادہ نظر آتا حتی الامکان ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہوتی تھی۔

اس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصول سے ہوتی ہے جو قطائع کے بارے میں نافذ تھے اور اس طرزِ عمل سے بھی ہوتی ہے جو خلفاء کا اس سلسلہ میں تھا

قطائع انہی لوگوں کو دیئے جاتے تھے جن کا عام مفاد سے تعلق رہتا تھا

حکومت الٰہی میں انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے تھے جو کاشتکار ہوتے یا جن کے ذمہ مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی جس کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتے بلکہ دوسروں سے کاشت کرا کے اس کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ مقریزی[۴]

۱؎ الاموال ص ۲۹۰ - ۲؎ الخراج یحییٰ ص ۹۳ ۳؎ الخراج یحییٰ ص ۸۰ - ۴؎ تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔

قاضی ابو یوسف یہ کلیہ بیان کرتے ہیں

قَدْ أَقْطَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتَأَلَّفَ عَلَى الْإِسْلَامِ أَقْوَامًا وَأَقْطَعَ الْخُلَفَاءُ مَنْ رَأَوْا أَنَّ فِيْ إِقْطَاعِهِ صَلَاحًا[1]

پیغمبرِ اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انہی لوگوں کو قطائع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک و ملت کی بھلائی ہوتی تھی اور قطائع دینے میں تالیفِ قلوب مقصود ہوتی تھی۔

علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:- خلیفہ کے قطائع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے وہ ان لوگوں کو عطا کر دے جن میں اس کی اہلیت و صلاحیت دیکھے۔[2]

زمانۂ خلافت میں جن کو قطائع دیئے جاتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ جن میں آبادکاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی تھی۔

۲۔ جن کے سپرد مفادِ عامہ کی کوئی خدمت ہوتی تھی۔

۳۔ فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔

۴۔ نومسلموں کو تالیفِ قلوب کے لئے قطائع دیئے جاتے تھے۔

بسا اوقات لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو نادار اور محتاج پاتے تھے اور اُن کے پاس گذر بسر کی کوئی شکل نہ رہ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں خلافت انھیں قطائع دے کر کسبِ معاش کے قابل بناتی تھی۔ اس حسنِ سلوک سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ نومسلم کو اسلام قبول کرنے کے بعد معاشی پریشانیوں سے دوچار ہونا نہیں پڑتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر خدمتِ خلق اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے میں اپنی توجہ خرچ کرتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ غیر مسلموں کو یہ حسنِ سلوک دیکھ کر، سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے پیشِ نظر 'قطائع' کا مقصد اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانا اور عام خوشحالی کی فضاء پیدا کرنا ہوتا تھا اس لئے بالعموم انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے جو زمین کو زیرِ کاشت لا کر پیداوار بڑھا سکتے تھے۔ اور اگر کوئی خدمت سپرد ہونے کی بناء پر خود کاشت نہ کر سکتے تو دوسروں کے ذریعہ کاشت کرا کے اس مقصد کو پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ نے فرمایا۔

وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَمْ يَأْتُوْهُ وَلَمْ يُقْطِعُوْا حَقَّ مُسْلِمٍ وَلَا مُعَاهِدٍ[3]

(اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہ اور خلفاء کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے (اس لحاظ سے کہ زمین میں سب شریک ہیں))

---

[1] الخراج ص ۶۱ و الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۹۶ [2] عینی ج ۲ ص ۳۶ [3] مزید تحقیق و تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الخراج ص ۶۰ و ۶۱ و ۶۲ و الاموال ص ۷۹ و ۸۰ و ۸۱ و ۲۸۳۔

قطائع لوگوں کو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ضرورت وصلاحیت کے مطابق دیئے جاتے تھے

باقی رہی یہ بات کہ زمانۂ خلافت میں ایک شخص کو زمین کی کتنی مقدار دی جاتی تھی اس سلسلہ میں تاریخ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی حیثیت سے چند باتیں لائقِ توجہ ہیں۔

۱۔ اس زمانہ میں بنجر اور افتادہ زمینیں بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

۲۔ پیداوار آج کے مقابلہ میں کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

۳۔ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت تک فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوتی تھیں۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر کے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔

۵۔ تنخواہ اور وظیفہ مقرر ہونے کی صورت میں ان لوگوں کے لئے جن کے متعلق مفادِ عامہ کی خدمت سپرد ہوتی تھی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ (۱) ڈیوٹی چھوڑ کر خود کاشت کے ذریعہ اپنی گزر بسر کرتے۔ (۲) یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار میں یا اس کی آمدنی میں دونوں شریک ہوتے اور اس طرح کاشتکار اور صاحبِ زمین دونوں حسبِ حیثیت مفادِ عامہ کی خدمت کرتے رہتے۔

۶۔ تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی زمین جائداد کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں:

(ا) صدیق اکبرؓ نے حضرت طلحہؓ کو قطیعہ دیا تھا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکنامہ ان کے حوالہ کر دیا تھا، ان گواہوں میں حضرت عمرؓ کا نام بھی تھا۔ حضرت طلحہؓ حسبِ دستور حضرت عمرؓ کے پاس حکنامہ پر دستخط کرانے کے لئے گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا:

أَهٰذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے لوگ محروم رہیں۔

اس کے بعد حضرت طلحہؓ غصہ میں بھرے صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور کہا:

وَاللّٰهِ مَا أَدْرِي أَنْتَ الْخَلِيفَةُ أَمْ عُمَرُ؟

واللہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب میں کہا: بل عمر (بلکہ عمر ہیں)

الغرض حضرت عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے صدیق اکبرؓ کا یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تھا۔[۵]

(ب) حضرت عیینہؓ کو صدیق اکبرؓ نے قطعیہ دیا تھا۔ جب وہ دستخط کرانے حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو انھوں نے دستخط سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے حکم کو مٹا دیا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت عیینہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور دوسرا حکنامہ لکھ کر دینے کی

۵ الاموال ص ۲۰۳

درخواست کی۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے جواب میں فرمایا:۔

وَاللّٰهِ لَا أُجَدِّدُ شَيْئًا رَدَّهُ عُمَرُ

واللہ میں وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کیا ہو

یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے دستخط سے کیوں انکار کیا تھا جبکہ رسول اللہ اور ابوبکرؓ اور خود عمرؓ سے تطیعہ دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمرؓ نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی۔

أَهَذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیقؓ و فاروقؓ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا یعنی قطائع دے کر زمین کو زیر کاشت لانا تاکہ خلق اللہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غذا مہیا ہو سکے مگر یہ بات ہر وقت دونوں کو ملحوظ رہتی تھی کہ زمین چند افراد کے ہاتھ میں پڑ کر ان کے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے بیکار نہ پڑی رہے۔ اور حقوقِ عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پامال ہوتے رہیں۔ اس لئے قطائع دینے میں یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف انہی لوگوں کو دیئے جائیں جو اس کے اہل تھے اور اس مقدار میں دیئے جائیں جن کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنایا جا سکے۔

مذکورہ صورتوں میں حضرت عمرؓ نے جب دستخط سے انکار کیا تھا تو صدیق اکبرؓ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے انکار کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ زمین کسی حیثیت سے مفادِ عامہ کے خلاف جا رہی ہے! اور فلاں شخص کو تطیعہ دینے میں کسی حد تک مقصد کی پامالی ہو رہی ہے ورنہ حضرت عمرؓ کو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ قرار دے کر دوسرا حکمنامہ لکھنے کی درخواست رد کر دی تھی۔

حکومتِ الٰہی میں نہ تو کسی فرد کو بیکار رہنے دیا جاتا تھا اور نہ دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کسی کو عیش و عشرت کا موقع دیا جاتا تھا۔ اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت و صلاحیت دیکھی جاتی تو زمین اس کے حوالہ کر کے اسے خلق اللہ کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر وہ شخص دیگر مفادِ عامہ کے کاموں کے لئے موزوں ہوتا تو اس مقدار میں 'تطیعہ' دیئے جاتے تھے کہ وہ دوسروں کے ذریعہ کاشت کرا کے اپنی گزر بسر کے لائق آمدنی یا پیداوار حاصل کر سکے تاکہ اس کو دیگر کام اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں سہولت ہو۔ ایسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت کے مطابق خدمتِ خلق کرتا تھا اور صاحبِ زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔ نہ کوئی شخص بیکار رہنے پاتا تھا اور نہ کسی کو اس کی صلاحیت اور طبیعت کے خلاف ڈیوٹی سپرد کی جاتی تھی۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص مفادِ عامہ کے کاموں میں لگا رہتا تھا اور سب کام نہایت

لہ الاموال۔ ص ۲۸۳

خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ہر شخص اپنی ضمیر کی آزادی اور صلاحیت کے لحاظ سے اپنی اپنی لائن میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا تھا، نہ کسی کے ذہنی طور پر خودکشی کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ کسی کو مزاج اور طبیعت کے خلاف محض سرمایہ اور روپیہ کی خاطر کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ غرض زمانہ خلافت میں جماعت جماعتی حیثیت سے خوش تھی امور اپنی انفرادی حیثیت سے خوش تھا۔ نہ فرد کو جماعت سے شکایت تھی اور نہ جماعت کو فرد پر اعتراض تھا۔

قطائع کے بارے میں اسی پوزیشن کو واضح کرنے کے لئے علامہ بدر الدین عینیؒ نے فرمایا:-

يَجُوزُ لِلْجُنْدِيِّ الَّذِي يُقْطَعُ لَهُ أَنْ يُؤْجِرَ مَا أُقْطِعَ لَهُ[۱]

لشکری اور فوجی کے لئے اپنے قطائع کرایہ پر دینا جائز ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:-

وَلَا يُقْطَعُ إِلَّا قَدْرَ مَا يَتَأَتَّى الْعَمَلُ عَلَيْهِ[۲]

اسی مقدار قطیعہ دیا جائے جس پر اس کا کام کرنا آسان ہو۔

پھر کہتے ہیں:-

امام را باید کہ اقطاع کند بقدر حاجت[۳]

خلیفہ کو بقدر ضرورت قطیعہ دینا چاہیئے۔

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہوئیں (۱) پہلی تو یہ کہ حاجت و ضرورت سے زائد کسی کو قطیعہ نہ دیا جائے۔ (۲) دوسری یہ کہ بوقت ضرورت و مصروفیت اپنے قطیعہ کو کرایہ وغیرہ پر دیا جا سکتا ہے۔

قطائع پر خلافت کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے زیادہ ہوتے ہیں

زمانہ خلافت کے دیئے ہوئے قطائع، سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ ہوتے تھے بلکہ بہ نسبت دیگر آراضی کے خلافت کے اختیارات قطائع میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔ کیونکہ خلافت کا براہ راست تعلق قطائع زمینوں سے ہوتا تھا اور قطائع بالعموم انہی زمینوں سے دیئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے نظام تنظیم و تقسیم میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ رہتی تھی۔ جب اس میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی تو اس کے اختیارات کا وسیع ہونا ایک فطری امر تھا تاکہ دونوں جانب توازن قائم رہ سکے۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ اختیارات کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قطائع اگر عشری زمین سے دیئے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا اور خراجی زمین سے دیئے گئے ہیں تو خراج واجب ہوگا۔"[۴]

پھر آگے چل کر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:-

---

[۱] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۲۰۳ [۲] مسوّیٰ ص ۵۰۰ [۳] مصفیٰ ص ۵۰۴ [۴] الخراج ص ۵۹، ۶۰

"جس کسی کو خراجی زمین سے تعاش دیئے جائیں تو ٹیکس کے بارے میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ پیداوار کا دسواں، پندرھواں بیسواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ یا خراج بہرحال جو مناسب سمجھے وہ ٹیکس مقرر کر دے۔[1]

پھر کہتے ہیں:-

وَ اَرْجُوْ اَنْ یَّکُوْنَ ذٰلِکَ مُوَسَّعًا عَلَیْہِ فَکَیْفَ مَا شَاءَ مِنْ ذٰلِکَ فَعَلَ[2]

مجھے امید ہے کہ اس بارہ میں خلافت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔

یہی امام، ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

وَ اعْمَلْ بِمَا تَرٰی اَنَّہٗ اَصْلَحُ لِلْمُسْلِمِیْنَ وَ اَعَمُّ نَفْعًا لِخَاصَّتِھِمْ وَ عَامَّتِھِمْ وَ اَسْلَمُ لَکَ فِیْ دِیْنِکَ[3]

مفادِ عامہ کے پیشِ نظر جس میں مسلمانوں کی اور تمام لوگوں کی فلاح و بہبودی ہو آپ کو اس میں بالکلیہ اختیار ہے اور دین و ملت کے لحاظ سے بھی وہی زیادہ محافظ ہے۔

حاصل یہ کہ حکومت الٰہی میں زمین جاگیر اور نہ ذاتی وقار او راقتدار بڑھانے کے لئے ہوتے تھے اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے فائدہ اٹھاکر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کرکے مفادِ عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے ہوتی تھیں اسی لئے قانون اور ٹیکس کے معاملات میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے تھے۔

جس طرح خلق اللہ کی ضروریات مہیا کرنا خلافت کا فرض تھا اور جانوروں تک کا انتظام اس کی ڈیوٹی میں داخل تھا اسی طرح قدرت کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلافت کے اختیارات کی وسعت اس کا حق تھا تاکہ آزادی کے ساتھ حقیقی معنوں میں وہ نیابت کے فرائض انجام دے سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری و جاگیرداری کی شکل زمانۂ خلافت کے تعامل سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیردار و زمیندار ایک وسیع حصۂ زمین کا مالک ہوکر کاشتکاروں اور مزدوروں سے کام لیتا ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اُن کے منافع سے عیش و آرام کرتا ہے۔

اس سے ایک طرف تو راحت طلبوں اور مفت خوروں کا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاکر سوسائٹی کے لئے بار بنتا ہے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ان کی محنت کا پورا حق نہیں ملتا، جس کی بناء پر انھیں رات دن کی محنت کے باوجود فراغت کے ساتھ روٹی میسر نہیں آتی۔

قطع نظر اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی، بلکہ اسلام ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے اور

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] الخراج ص ۵۹، ۶۰۔

زمانۂ خلافت کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں جن سے اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

زمانۂ خلافت کے چند اہلِ قطائع کا ذکر اور ایک مسلمہ حقیقت پر استشہاد

ذیل میں چند ان لوگوں کے نام درج کئے جاتے ہیں جن کو رسول اللہ اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے "قطائع" دیئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ حکومتِ الٰہی میں اہلِ قطائع مفادِ عامہ کی خدمت پر مامور ہوتے تھے یا دوسروں کی محنت سے عیش و عشرت کرنے والے ہوتے تھے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کو قطیعہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۲) آپ نے علقمہؓ کو حضرموت میں ایک زمین عطا کی تھی (ترمذی)

(۳) حضرت زبیرؓ کو زمین کا ایک بڑا حصہ دیا تھا۔ (الخراج لابی یوسف)

(۴) حضرت بلالؓ ابن حارث کو "وادیٔ عقیق" عطا فرمائی تھی (الاموال)

(۵) آپ نے فرات بن حیان عجلی کو یمامہ میں ایک زمین دی تھی (〃)

(۶) یمامہ کے بعض دوسرے لوگوں کو بھی بنجر زمین عطا فرمائی تھی (〃)

(۷) آپ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ میں مکان دیئے تھے۔ (مشکوٰۃ)

(۸) اور ابو رافعؓ کے خاندان کو بنجر زمین کا ایک بڑا حصہ عطا فرمایا۔ (الخراج لابی یوسف)

(۹) آپ نے انصار میں کے ایک شخص سلیطؓ نامی کو زمین دی تھی (الاموال)

(۱۰) عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو زمین دی تھی۔ (مسند امام احمد)

(۱۱) بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے آپ نے اعلانِ عام کر دیا تھا کہ "زمین اللہ کی ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں۔ بنجر زمین کو جو شخص بھی زیرِ کاشت لانا چاہے اس کو پورا اختیار ہے ایسی صورت میں زمین اسی کی ملک ہو گی۔

(نصب الرایہ و الخراج لابی یوسف)

(۱۲) رسول اللہ کے بعد بھی قطائع دینے کا یہ سلسلہ قائم رہا اور متعدد صحابہ مثلاً سعد بن ابی وقاصؓ عبداللہ بن مسعودؓ، نافعؓ، خبابؓ زبیرؓ، اسامہ بن زیدؓ، عمار بن یاسرؓ، سعد بن مالکؓ وغیرہ کو قطائع دیئے گئے۔ (بخاری و الاموال و الخراجین)

(۱۳) اور آپ کے بعد بھی یہ اعلان عام کر دیا گیا تھا کہ جو شخص بنجر زمین کو زیرِ کاشت لائے گا وہ اس کی ہو جائے گی (ایضاً)

ان اعلانات کی وجہ سے بہت سی بنجر زمینیں لوگوں کے استعمال میں آ گئی تھیں اور غیر آباد زمینیں جو پہلے بیکار پڑی تھیں اب ان سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچنے لگا تھا۔

تاریخ کے طلباء پر یہ بات واضح ہے کہ جن بزرگوں کے نام قطائع کے سلسلہ میں اوپر درج کئے گئے ہیں وہ سب ایسے تھے جو خدمتِ خلق اور مفادِ عامہ کے کاموں کے لئے وقف تھے ان کے علاوہ بہت سے اہلِ قطائع کاشتکار ہوتے تھے جو زمین کو زیرِ کاشت لا کر خود بھی اس سے

فائدہ اٹھاتے تھے اور سرکاری ٹیکس کی ادائیگی کے ذریعہ وہ مفادِ عامہ کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ خلافت کی پوری تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ قطائع کسی کے پاس عیش و آرام کا سامان بنے ہوں یا یہ دوسروں کی محنت کھانے والا مفت خور طبقہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنے ہوں۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ زمانۂ خلافت کے مجموعی حیثیت سے تمام قطائع کے متعلق یہ کلیہ بیان کرتے ہیں؛

فَقَدْ جَاءَتْ هٰذِهِ الْآثَارُ بِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْطَعَ أَقْوَامًا وَ أَنَّ الْخُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِهٖ أَقْطَعُوْا أَوْ رَأَىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ الصَّلَاحَ فِيْمَا فَعَلَ مِنْ ذٰلِكَ إِذْ كَانَ فِيْهِ تَأَلُّفٌ عَلَى الْإِسْلَامِ وَ عِمَارَةٌ لِلْأَرْضِ وَكَذٰلِكَ الْخُلَفَاءُ إِنَّمَا أَقْطَعُوْا مَنْ رَأَوْا أَنَّ لَهٗ غَنَاءً فِي الْإِسْلَامِ وَ نِكَايَةً لِلْعَدُوِّ وَ رَأَوْا أَنَّ الْأَفْضَلَ مَا فَعَلُوْا وَ لَوْلَا ذٰلِكَ لَمْ يَأْتُوْهُ وَ لَمْ يُقْطِعُوْا حَقَّ مُسْلِمٍ وَلَا مُعَاهِدٍ[۱]

یہ آثار اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفاء نے لوگوں کو قطائع دیئے تھے اور اسی میں لوگوں کی فلاح و بہبود سمجھی تھی۔ رسول اللہ نے نومسلموں کو تالیفِ قلب کے لئے اور زمین کو زیرِ کاشت لانے کے لئے قطائع دیئے وہ وہی لوگ تھے جن کا اسلام میں کوئی فائدہ تھا اور وہ لوگ امن و امان کے قیام پر مامور ہوتے تھے اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر کسی کو کسی مسلم یا معاہد کا حق دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حاصل یہ کہ زمانۂ خلافت میں ان لوگوں کو اس لئے قطائع نہ دیئے جاتے تھے کہ ان کے ذریعہ اہلِ قطائع عیش و عشرت کریں۔ بلکہ یہ قطعات انہیں معاش کی فکر سے آزاد کر کے خدمتِ خلق کے لئے وقف ہو جانے کا سامان کیا کرتے تھے۔

یہ حقیقت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ الٰہی کی طے شدہ مقرر کردہ پالیسی یہ ہے کہ زمین اور جائیداد ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ابتداءً کسی کو دی جا سکتی ہے اور نہ بعد میں کسی کے پاس باقی رکھی جا سکتی ہے۔ یہ صرف مفادِ عامہ کے پیشِ نظر لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ان سے واپس لے لی جاتی ہے۔ حکومتِ الٰہی میں اصل چیز مفادِ خلق ہے۔ جب تک یہ حاصل ہوتا رہتا ہے خلافت کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جب یہ فوت ہونے لگتا ہے تو خلافت اس وقت ہر تصرف کی مجاز ہوتی ہے۔ چنانچہ زمانۂ خلافت میں قوم بحیثیت کُل سے قطائع کا واپس لے لینا جس کی تفصیل آگے چل کر آتی ہے، اور بلال بن حارثؓ مزنی کے قبضہ سے غیر آباد اراضی کا نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے وہ سب اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

---

[۱] الخراج۔ ص ۶۲

قطائع پر خلافت کے اختیارات کے بارے میں چند تصریحات

اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:۔

لَنَا رِقَابُ الْاَرْضِ[1]

زمینیں دراصل ہماری (خلافت کی) ہیں

اور حضرت علیؓ نے ایک شخص سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا:۔

اِنَّ اَرْضَكَ فِي لَنَا[2]

بیشک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے۔

اسی حقیقت کو حافظ ابوبکر جصاصؒ یوں ادا کرتے ہیں:۔

"ہر وہ زمین جس کی آبادکاری سے لوگ عاجز رہیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پامال ہونے لگیں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے[3]"

قاضی ابویوسفؒ فرماتے ہیں:۔

وَلَا يُخْرِجُ مِنْ يَدِهِ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا اِلَّا بِحَقٍّ يَجِبُ لَهُ عَلَيْهِ فَيَأْخُذُهُ بِذَالِكَ الَّذِي وَجَبَ لَهُ[4]

اہل قطائع کو خلافت (بلاوجہ) بیدخل نہ کرے البتہ اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو اس کو بیدخل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ "اِلَّا بِحَقٍّ يَجِبُ لَهُ عَلَيْهِ" نہایت قابل غور ہے اور اپنے عموم مفہوم کی بنا پر حقوقِ عامہ کے ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے۔ اسی سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کی یہ تصریح ہے:۔

اِنَّ نَوَاحِيَ دَارِ الْاِسْلَامِ تَحْتَ يَدِ اِمَامِ الْمُسْلِمِيْنَ[5]

دارالاسلام کے جملہ حصے خلیفۃ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں۔

اور امام مالکؒ کا یہ ارشاد ہے:۔

تَصِيْرُ الْاَرْضُ لِلسُّلْطَانِ[6]

زمینیں دراصل بادشاہ (حکومت) کی ہوتی ہیں۔

ایک موقع پر علامہ عینی کہتے ہیں۔

---

[1] الاموال ص ۲۷۹ [2] احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۲ [3] الخراج ص ۶۰ [4] مبسوط ج ا ص ۱۹۳ از اسلام کے معاشی نظریئے۔ [5] المحلی ج ۸ از مقالہ اسلامی اشتراکیت۔

إِنَّ حُكْمَ الْأَرَاضِي إِلَى الْإِمَامِ[1]

دراصل زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے۔

چونکہ اراضی کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے ہیں اس لئے خلیفہ کو مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ اراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز سمجھی جاتی ہے۔ آراضی موقوفہ کی بحث میں فقہا نے تصریح کی ہے۔

إِنَّ السُّلْطَانَ يَجُوزُ لَهُ مُخَالَفَةُ الشَّرْطِ إِذَا كَانَ غَالِبُ جِهَاتِ الْوَقْفِ قُرًى وَ مَزَارِعُ فَيَعْمَلُ بِأَمْرِهِ وَ إِنْ غَايَرَ شَرْطَ الْوَاقِفِ لِأَنَّ أَصْلَهَا لِبَيْتِ الْمَالِ[2]

جب واقف کی اکثر جہات گاؤں، اور مزروعہ زمینیں ہوں تو خلافت اپنے صوابدید کے مطابق انتظام کرے اگرچہ واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی جاتی ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں دراصل بیت المال (خلافت) کی ہوتی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ میں زمین اور جائیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بحیثیت امین اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں یا یہ حق استعمال اس کے پاس اسی وقت تک باقی رکھا جاتا ہے جب تک خلق اللہ کے مفاد میں وہ خلافت کا ہاتھ بٹا سکے اور ایسی فضا پیدا کرنے میں مددگار بنے جو مخلوق کی خوشحالی اور ترقی کی ضامن ہو لیکن جب اس کی خلاف ورزی ہونے لگے یا امانت میں خیانت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو خلافت کو بلا پس و پیش زمین سے بے دخل کر دینے یا جو بہتر صورت اس کی سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

خلافت کے اس اقدام میں نہ حقوق ملکیت کا گورکھ دھندا حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے ہر تصرف اور ہر فیصلہ میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے اس قسم کے تمام مواقع میں وہ ذاتی و انفرادی مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے البتہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کے ٹکراؤ کی شکل میں وہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔

دراصل اسی انفرادی حق کے تحفظ کے ماتحت زمانہ خلافت میں بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جن میں صاحب زمین کو ان کی زمین لے لینے کے بعد کچھ رقم ادا کی گئی تھی تاکہ اس شخص کے ذاتی حقوق پامال نہ ہونے پائیں۔ کبھی تو اس کی شکل معاوضہ کی ہوتی تھی جیسے کہ حضرت عمرؓ نے جب وادی القریٰ کے باشندوں کو منتقل کرنا چاہا تو ان کی آراضی اور نخلستان کی ایک ایک پائی قیمت لگا کر جو نوے ہزار کے قریب ہوتی تھی ان کے حوالہ کیا تھا۔[3]

اور جس طرح نجران کے باشندوں کو جب سیاسی مصلحت کی بنا پر منتقل کیا گیا تو زمین کے عوض زمین دی گئی اور فدک کے لوگوں کو منتقلی کے وقت زمین کی قیمت ادا کی گئی تھی ہر ایک کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے اور جس طرح مدینہ کے یہودیوں کو ان کے

---

[1] رد المختار [2] در مختار۔ ج ۱ [3] الاحکام السلطانیہ ماوردی ص ۱۶۴۔

منتقل کرنے سے پیشتر اپنی اپنی زمینیں فروخت کرنے کا حکم دیا تھا۔[1]

اور کبھی حکومت کی جانب سے دی ہوئی رقم کی حیثیت معاوضہ کی نہ ہوتی تھی بلکہ بطور امداد ہوا کرتی تھی۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے قوم جبلہ کے ابن جریر اور ایک عورت ام کرز کو اسّی اسّی دینار کے قریب دیا تھا۔ اس کی حیثیت امداد کی تھی نہ کہ معاوضہ کی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

آراضیٔ مُسلم

مسلم کی زمینیں مفادِ عامہ کے پیشِ نظر انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں

جس زمین کے باشندے اسلامی دعوت قبول کرکے مسلمان ہو جاتے تھے ان کی زمین کی تنظیم و تقسیم کے بارے میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اللہ کی ملک قرار دی جاتی تھیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان سے کچھ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

عام قانون رسول اللہؐ کی زبان میں یہ تھا۔

إِنَّ الْقَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوا أَحْرَزُوا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ[2]

جب کوئی قوم اسلام قبول کرلے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیتی ہے۔

یہ قانون عرب، عجم کی تمام زمینوں کے لئے یکساں تھا اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ جائدادیں سب شریک تھیں۔

قاضی ابو یوسف صاحب اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فَإِنَّ دِمَاءَهُمْ حَرَامٌ وَمَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَكَذٰلِكَ أَرْضُوهُمْ
لَهُمْ وَهِيَ أَرْضُ عُشْرٍ بِمَنْزِلَةِ الْمَدِينَةِ حَيْثُ أَسْلَمَ أَهْلُهَا مَعَ رَسُولِ اللهِ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ أَرْضُهُمْ أَرْضَ عُشْرٍ وَكَذٰلِكَ الطَّائِفُ وَالْبَحْرَيْنِ
وَكَذٰلِكَ أَهْلُ الْبَادِيَةِ إِذَا أَسْلَمُوا عَلَى مِيَاهِهِمْ وَبِلَادِهِمْ فَلَهُمْ مَا
أَسْلَمُوا عَلَيْهِ وَهُوَ فِي أَيْدِيهِمْ وَلَيْسَ لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْقَبَائِلِ أَنْ يَبْنِيَ فِي

---

[1] بخاری کتاب البیوع ص ۹! [2] ابوداؤد۔

ذلك شيئًا يستحق به منه شيئًا ولا يحجر فيه بيرًا يستحق به شيئًا وليس لهم أن يمنعوا الكلاء ولا يمنعوا الرعاء ولا المواشي من الماء ولا حافرًا ولا خفًا في تلك البلدة وأرضهم أرض عشر لا يخرجون عنها فيما بعد ويتوارثونها ويتبايعونها[1]

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں ان کا خون حرام ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہوگا وہ انہی کا رہے گا ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی اور اس قسم کی زمینیں عشری ہوں گی جس طرح مدینہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں اور جس طرح طائف اور بحرین کے لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے قبیلہ والوں میں سے کسی کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرف کریں جس کی بنا پر اس کے وہ مستحق بن جائیں اور نہ اس میں کسی کو (بلا اجازت) کنواں کھودنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ حصے کے وہ مستحق ہو جائیں۔ البتہ انھیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں اور جانوروں اور اونٹوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ ان کی زمینیں عشری ہوں گی بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور وہ ان کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔[2]

یہی قاضی صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

وكذلك بلاد أسلم عليها أهلها فهي لهم وما فيها[3]

ایسے ہی جس شہر و علاقہ کے لوگ اسلام قبول کرلیں تو اُن کی زمین اور ساری چیزیں (حسبِ سابق) انہی کی رہیں گی۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں:

"جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ کچھ نہ دینا پڑے گا۔"[4]

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

كل أرض أسلم عليها أهلها فهم مالكون لرقابها كالمدينة والطائف واليمن والبحرين.[5]

---

[1] الخراج ص ۶۳ [2] جیسا کہ ذرا آگے چل کر واضح ہو جائے گا یہ طریقِ کار ابتدائی مصالح کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ ورنہ خلافت کو حق حاصل تھا کہ وہ اراضیات میں جس طرح کا بھی چاہے تصرف کرے کیونکہ اراضی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی [3] الخراج ص ۱۶ [4] الاموال ص ۵۱۳ [5] ایضاً

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ضبط نہیں کی جائے گی اور انہیں انتفاع اور استعمال کا حق رہے گا) جیسے مدینہ۔ طائف۔ یمن۔ بحرین وغیرہ میں یہی کیا گیا تھا۔

الغرض زمانہ خلافت میں مسلموں کی زمین جائیداد کا یہی انتظام تھا خواہ وہ غلبہ سے فتح کیے ہوئے ممالک کے باشندے ہوتے یا وہ لوگ ہوتے جن سے پہلے مصالحت ہوگئی ہوتی اور بعد میں اسلام کی حقانیت وصداقت واضح ہونے کے بعد اسلام قبول کرلیا ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ آراضی مسلم کے بارے میں ایک اور بات خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ دراصل اسلام کا مقصد ایک ایسی صالح جماعت بنانا ہے جس کا نصب العین دوسروں کے لئے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہو خواہ اس کی خاطر اسے جان و مال قربان کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کے دلوں سے ذاتی منفعت اور عیش وعشرت کا بُت نکال کر قربانی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ با اقتدار جماعت میں جب کوئی فرد داخل ہوجاتا ہے تو اسے ہر قسم کی جائز و ناجائز رعایتیں دی جاتی ہیں اس کی زیادتیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور اس کو اتنی زیادہ چھوٹ ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کرکے خود عیش کرسکے۔

> **مسلم ہونے کی حیثیت سے چونکہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اس لئے یہ لوگ خود اپنی زمینیں کبھی تو خلافت کے حوالے کردیتے تھے اور کبھی خلافت ان سے لے لیتی تھی۔**

لیکن اسلامی جماعت میں داخل ہونے والے سے اللہ کے لئے ہر چیز وقف کردینے کا عہد لیا جاتا ہے اور اپنے کو فنا کرکے دوسرے کی بقا کا سامان فراہم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، اسی لئے مسلم کی زمین وجائیداد میں خلافت اپنے اختیارات بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ کبھی ترغیب وترہیب کے ذریعہ اور کبھی قانون کے ذریعہ، جیساکہ تاریخ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم باشندے اپنی جائیدادیں عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالے کردیتے تھے یا خلافت بوقت ضرورت بذریعہ قانون ان سے لے لیتی تھی۔ چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) ابتدا اسلام میں مدینہ کے مسلم باشندوں نے اپنی زمینیں پانی کی دشواری کی وجہ سے عام مفاد کے پیش نظر رسول اللہؐ کے حوالہ کردی تھیں کہ آپ جن لوگوں میں چاہیں انہیں تقسیم کردیں۔

> **مدینہ کے لوگوں نے برضا و رغبت اپنی زمینیں خلافت کے حوالہ کردی تھیں۔**

اسی واقعہ کے متعلق ابن عباس رضؓ کہتے ہیں:

إِنَّ رَسُولَ اللهِ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِينَةَ جَعَلُوا لَهُ كُلَّ أَرْضٍ لَا يَبْلُغُهَا الْمَاءُ يَصْنَعُ بِهَا مَا يَشَاءُ[۱]

---

[۱] الاموال ص ۲۸۲

رسول اللہؐ جب مدینہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ نے ہر ایسی زمین آپ کے حوالہ کردی جس میں پانی کا پہنچنا دشوار تھا اور آپ کو اختیار دے دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔

زمین ملنے کے بعد آپ نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش کی اور ابو عبیدؒ کی رائے کے مطابق آپ نے بلال بن حارث کو اسی زمین سے "قطیعہ" عطا فرمایا[۱]۔

قوم بجیلہ کی زمینیں خلافت نے لے لی تھیں

(۲) خالصہ زمین کا کچھ حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بجیلہ کو دیدیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا، لیکن جب خلافت نے مفادِ عامہ کے پیشِ نظر واپس لینا چاہا تو بلا پس و پیش ان لوگوں کو خلافت کے حوالہ کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

قیس بن حازم کہتے ہیں جنگ قادسیہ (جو ایرانیوں سے ہوئی تھی) کے دن اسلامی فوج میں قوم بجیلہ کے لوگ چوتھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھائی حصہ دے دیا تھا۔ دو یا تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اسی قبیلہ کے چند افراد عمار بن یاسر اور جریر وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفادِ خلق کے لئے خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔ اس پر ان لوگوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالہ کردی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اسی دینار عطا فرمائے[۲]۔

جب اس واقعہ کی خبر قوم بجیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا کہ

يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِنَّ أَبِي هَلَكَ وَ سَهْمُهُ ثَابِتٌ فِي السَّوَادِ وَ إِنِّي لَمْ أُسَلِّمْ، فَقَالَ لَهَا يَا أُمَّ كُرْزٍ إِنَّ قَوْمَكِ قَدْ صَنَعُوْا مَا قَدْ عَلِمْتِ فَقَالَتْ إِنْ كَانُوْا قَدْ صَنَعُوْا مَا صَنَعُوْا فَإِنِّي لَسْتُ أُسَلِّمُ حَتّٰى تَحْمِلَنِي عَلٰى نَاقَةٍ ذَلُوْلٍ عَلَيْهَا قَطِيْفَةٌ حَمْرَاءُ وَ تَمْلَأَ كَفِّي ذَهَبًا قَالَ فَفَعَلَ عُمَرُ ذٰلِكَ فَكَانَتِ الدَّنَانِيْرُ نَحْوًا مِنْ ثَمَانِيْنَ دِيْنَارًا[۳]

اے امیر المومنین میرے والد کی وفات ہو گئی ہے، سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اس کو کبھی واپس نہ کروں گی حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے ام کرز تیری قوم نے بلا چون و چرا واپس کر دیا ہے اور تجھے اچھی طرح اس کا علم ہے، اس نے جواب دیا قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے میں تو اس وقت تک واپس نہ کروں گی جب تک کہ آپ مجھے ایک فرمانبردار اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور زر و مال سے میرا ہاتھ نہ بھر دیں۔ حضرت عمرؓ

---

[۱] الاموال ص ۲۸۲ [۲] الاموال ص ۶۱ و ۶۲ و الخراج لیحییٰ ص ۴۵ و ۴۶ [۳] ایضاً

لئے آخر ایسا ہی کیا اور نقدی جو آپ نے اس کو دی تھی اس کی تعداد تقریباً اسی دینار کو پہنچ گئی تھی۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت جب چاہے مفادِ عامہ کے پیشِ نظر مسلم باشندوں کو بیدخل کر کے ان کی زمینیں لے سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پائمالی نہ لازم آئے۔

لیکن اس واقعہ سے یہ بات لازمی طور سے نہیں ثابت ہوتی کہ خلافت کی جانب سے صاحبِ زمین کو جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت معاوضہ کی ہو یا حضرت عمرؓ نے جو کچھ جریر اور ام کرز کو دیا تھا اس کی حیثیت معاوضہ کی تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ جب مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ایسی صورت پیش آجائے تو خلافت کو بلا معاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو کچھ تصرفات کئے جائیں ان میں صاحبِ زمین کی رضامندی ضروری ہے جیسا کہ ذیل کی تصریحات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں۔

جو لوگ مفتوحہ زمین کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دینے میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (امام شافعی کا یہی خیال ہے) یہ واقعہ ان کے لئے کیسے دلیل بن سکتا ہے جبکہ اسی جیسے واقعے عراق و شام کی فتح میں اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دیئے جانے کے بارے میں حضرت بلال وغیرہ نے جب حضرت عمرؓ کی مخالفت کی تھی اور زمین کو فوجیوں پر تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو آپ نے ان سب کے متعلق فرمایا: اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْھِمْ (اے اللہ تو ہی ان کے لئے کافی ہے) اس وقت کون سی ان لوگوں کی رضامندی مطلوب تھی (جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی حضرت عمرؓ ام کرز کو راضی کرنا چاہتے تھے اور بغیر رضامندی کے انہیں بیدخل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا)[۱]

ابوبکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات صاف طور پر کہہ دی تھی کہ زمین کو واپس لئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ باقی رہا ام کرز عورت کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی، ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضہ کی زمین واپس لئے بغیر سرکاری خزانہ سے اس کو عطیہ دیتے[۲]

پھر کہتے ہیں:

قوم بجیلہ کے اس واقعہ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ لوگ زمین کے مالک تھے، کیا اس کا امکان نہیں ہے

[۱] الاموال ص ۶۲ و ۶۳ [۲] احکام القرآن ج ۳۔ ص ۵۳۱ و ۵۳۳

کہ زمین بالکل تقسیم ہی نہ ہوئی ہو اور کل زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی گئی ہو۔ البتہ خراج کی آمدنی کا چوتھائی حصہ ان کے لئے خاص کر دیا گیا ہو پھر بعد میں عمر فاروقؓ نے مناسب سمجھا ہو کہ اس چوتھائی کے معاملہ کو ختم کر کے ان کو بھی عطایا دینے پر اکتفا کیا جائے تاکہ یہ لوگ بھی سب کے برابر ہو جائیں۔

جصاص کا یہ شبہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے مسئلہ کا رُخ ہی بدل جائے کیونکہ اس واقعہ کو محققین نے تسلیم کیا ہے اور ابو عبیدؒ وغیرہ نے بدلائل اس کو ثابت کیا ہے۔

بہرحال مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت جب صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ اس کا معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے البتہ اس شخص کے ذاتی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس تصرف کی وجہ سے وہ پائمال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین جائیداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو زمین وجائداد رکھنے اور کاشتکاری کرنے سے قانوناً منع کر دیا تھا اور یہ اعلان کرا دیا تھا کہ جب سب لوگوں کے اہل وعیال تک کے وظیفے سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ لوگ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں اور بیلوں کی دُم کے پیچھے لگے رہیں۔

علامہ طنطاوی جوہری اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

فَلَمَّا كَثُرَتِ الْأَمْوَالُ فِي أَيَّامِ عُمَرَ وَضَعَ الدِّيْوَانَ فَرَضَ الرَّوَاتِبَ لِلْعُمَّالِ وَالْقُضَاةِ وَمَنَعَ ادِّخَارَ الْمَالِ وَحَرَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ اقْتِنَاءَ الضِّيَاعِ وَالزِّرَاعَةِ وَالْمُزَارَعَةِ۔

لِأَنَّ أَرْزَاقَهُمْ وَأَرْزَاقَ عِيَالِهِمْ تُدْفَعُ لَهُمْ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ۔[1]

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب مال بہت بڑھ گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کئے گئے، لوگوں کے وظیفے مقرر ہوئے عاملوں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، سرمایہ جمع کرنے سے روک دیا گیا۔ کاشتکاری خود کرنے یا دوسروں سے کرانے دونوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے مع اُن کے بال بچوں تک کے وظیفے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔

ایک اہم قانون

کاشتکاری وغیرہ سے ممانعت کے اس قانون نے یہاں تک ترقی پائی تھی کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور

---

[1] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴

اس نومسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔[1]

غور سے دیکھا جائے تو فاروقِ اعظم کے اس فیصلہ میں حکومتِ الٰہی کے خلیفہ کی انجام بینی اور مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

دراصل اس ممانعت کے قانون سے خلیفہ کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ اگر یہ لوگ (مسلمان) زمین جائیداد اور مال جمع کرنے کے پیچھے پڑ گئے تو ظلم و فساد کے دروازے کھل جائیں گے اور خدمت خلق کے بجائے (جو ان کا مقصد زندگی ہے) دیگر حاکموں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے خون چوسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ عیش و عشرت میں پھنس کر یہ لوگ اپنے اصلی جوہر جوانمردی بہادری، جفاکشی، ہمت عزم وغیرہ کھو بیٹھیں گے جس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہوگا کہ جو جماعت محض خدمتِ خلق اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے کے لئے زندہ ہے پھر اسے زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے مسلمان جب مال و دولت اور جائیدادوں کے چکر میں الجھ گئے تو اس جماعت کے بلند اوصاف اور پاکیزہ صفات میں فرق پڑ گیا اور اس کے اصلی جوہر جن سے اس جماعت کی خمیر تیار ہوئی تھی وہ سب ایک ایک کرکے ختم ہو گئے۔

سب سے پہلے ملک شام میں جب مال و جائیداد کی ہوس عام ہونے کی داغ بیل پڑ رہی تھی تو حضرت ابوذر غفاری (جو ایک جلیل القدر صحابی اور اعلیٰ درجہ کے قانع اور زاہد شخص تھے) لوگوں کو حضرت عمرؓ کی مذکورہ ممانعت کے قانون کی طرف توجہ دلاتے تھے اور سختی کے ساتھ اس ہوس کی مخالفت کرتے تھے۔ عام تقریروں میں مجمع اور بازاروں میں کہتے پھرتے تھے کہ۔

يَا مَعْشَرَ الْأَغْنِيَاءِ وَيَا أُسْوَةَ الْفُقَرَاءِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ۔

اے مالدارو اور اے بدحال فقیرو (اللہ کا یہ فرمان ہے) جو لوگ سونا چاندی اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں نہ خرچ نہیں کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب سے خبردار کر دو۔

حالانکہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس وقت حضرت معاویہؓ شام کے گورنر تھے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ حضرت عثمانؓ سے حضرت معاویہؓ نے اپنے اخراجات کے پیشِ نظر بعض ان قطائع کو لینے کی اجازت چاہی جن کو حضرت عمرؓ نے عام لوگوں کے لئے بیت المال میں رکھا تھا اور سرکاری طور پر ان کا انتظام کراتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کی دیکھا دیکھی دیگر افسران اور صحابہ مثلاً طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ، یعلیٰؓ وغیرہ نے بھی زمین جائیداد رکھنا شروع کر دی تھی۔[2]

یہ ابتدائی شکل ایسی نہ تھی کہ اس سے کسی کی حق تلفی ہوتی یا سردست مفادِ عامّہ کے پامال ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا لیکن حضرت عمرؓ نے جس مقصد کے پیشِ نظر ممانعت کا قانون نافذ کیا تھا اس مقصد کے فوت ہونے کی داغ بیل پڑ رہی تھی جو آج نہیں تو

لہ نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ عه ایضاً عه ایضاً

کل اس جماعت کی زندگی کی چولیں ہلا دینے والی تھی۔ اس لئے مورخین اس تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی ممانعت کا یہی قانون نافذ کیا تھا۔

(۳) پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا قانون کو دوبارہ نافذ کیا تھا اور انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ علامہ طنطاوی کہتے ہیں:-

وَ اَیَّدَ ھٰذِہٖ الْقَاعِدَۃَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَ کَانَ یَقْتَدِیْ ابْنَ الْخَطَّابِ بِکُلِّ خُطُوَاتِہٖ[1]

اور حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقش قدم پر چلتے تھے۔

وہ قانون یہ تھا:

(۱) فَقَالَ اَیُّمَا ذِمِّیٍّ اَسْلَمَ فَاِنَّ اِسْلَامَہٗ یُحْرِزُ لَہٗ نَفْسَہٗ وَمَا لَہٗ وَمَا کَانَ مِنْ اَرْضٍ فَاِنَّھَا مِنْ فَیْءِ اللّٰہِ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ

اعلان کرا دیا کہ جو ذمی (غیر مسلم) اسلام قبول کرلے اس کی جان اور اموال منقولہ محفوظ رہیں گے۔ لیکن اموال غیر منقولہ وہ مسلمانوں کے لئے اللہ کی "فئے" ہو جائیں گے۔

(۲) وَ اَیُّمَا قَوْمٍ صَالَحُوْا عَلٰی جِزْیَۃٍ یُعْطُوْنَھَا فَمَنْ اَسْلَمَ مِنْھُمْ کَانَتْ دَارُہٗ وَ اَرْضُہٗ لِبَقِیَّتِھِمْ

اور جن لوگوں سے معاہدہ ہو گیا ہے وہ لوگ اگر اسلام قبول کرلیں تو اموال غیر منقولہ اسی قوم کے بقیہ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

یہ چند امثال ہیں جن سے ایک طرف تو مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اپنے ماننے والوں سے کتنا بلند اخلاق اور قربانی کا مطالبہ ہے اور نہ ماننے والوں کے ساتھ کتنا اور کس قدر منصفانہ سلوک ہے۔

آج بھی دنیا کی مہذب قوموں میں اپنی پارٹی والوں کے ساتھ رو رعایت جائز سمجھی جاتی ہے اور پارٹی اسی لئے اقتدار حاصل کرتی ہے کہ وہ اوروں کا خون چوس کر خود عیش و عشرت کر سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں مسلمان ہو کر کسی کا ناجائز طریقے پر مال لینے کا خیال تو الگ رہا جبکہ خود اس کا مال و جائیداد غیر مسلموں میں تقسیم کر دینے کا حکم ہے۔

---

[1] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ [2] ایضاً

یاد رکھئے! خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے

مجلسِ اقبالؒ

مثنوی رموزِ بیخودی

در معنیٔ ایں کہ ملتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ہم ندارد کہ دوامِ ایں ملتِ شریفہ موعود است

سابقہ باب میں علامہ اقبالؒ نے بتایا تھا کہ چونکہ ملتِ اسلامیہ کی بنیاد توحید و رسالت (آئیڈیلوجی) پر ہے اس لئے یہ کسی خاص خطۂ زمین میں محدود نہیں ہو سکتی۔ اس بناپر "وطنیت" کا وہ تصور جو سیاستِ حاضرہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، غیر قرآنی نظریہ ہے۔ دنیا کا کوئی انسان، خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو، جب اس آئیڈیلوجی کو تسلیم کرلے تو وہ اس ملت (اُمت) کا فرد بن جاتا ہے۔ اس لئے وطن (جغرافیائی حدود) کی بناپر قومیت کی تشکیل غیر قرآنی تصور ہے۔ زیرِ نظر باب میں وہ کہتے ہیں کہ جس طرح اُمتِ محمدیہ کسی خاص خطۂ زمین (space) میں محدود و مقید نہیں۔ اسی طرح وہ کسی خاص زمانے (Time) سے بھی منسلک نہیں۔ نبی اکرمؐ خاتم النبیین ہیں اس لئے حضورؐ کی رسالت کو دوام و استمرار حاصل ہے۔ چونکہ اُمتِ مسلمہ کی بنیاد رسالتِ محمدیہ کے ایمان پر ہے اس لئے اس اُمت کا دوام و استمرار بھی موعود ہے۔ یہ نہیں کہ جس طرح دنیا کی باقی قومیں کسی خاص زمانے (period of History) میں زندہ رہیں اور اس کے بعد ختم ہو گئیں، اسی طرح اُمتِ محمدیہ کے لئے بھی تاریخ کے کسی خاص دور میں بقا اور اس کے بعد فنا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص ملک میں بسنے والے مسلمان، کسی حادثہ کی وجہ سے، ختم ہو جائیں (جیسا کہ اسپین میں ہوا) لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں قرآن کو ماننے والی کوئی قوم باقی نہ رہے۔ زیرِ نظر باب میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس کی تمہید یوں شروع ہوتی ہے۔

در بہاراں جوشِ بلبل دیدۂ
رستخیزِ غنچہ و گل دیدۂ

موسمِ بہار میں تم نے دیکھا ہے کہ غنچوں اور پھولوں کی اٹھان کیا قیامت برپا کرتی ہے اور بلبلوں کا جوشِ جنون کس قدر شور انگیز ہوتا ہے،

چوں عروساں غنچہ ہا آراستہ
از زمیں یک شہر انجم خاستہ

کلیاں دُلہن نظر آتی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ستاروں کی ایک درخشندہ بستی زمین سے انگڑائیاں لیتی نمودار ہو گئی ہو۔

سبزہ از اشکِ سحر شوئیدہٴ
از سرودِ آبِ جو خوابیدہٴ

ندی کی نغمہ پاش روانیاں سبزے کو لوری دیکر سلاتی ہیں۔ اور جب وہ جاگتا ہے تو دایۂ سحر اپنے اشکوں (شبنم) سے اس کا منہ دھلاتی ہے۔

غنچہ بر می دہد از شاخسار
گیردش بادِ نسیم اندر کنار

غنچہ ایک تابناک ستارے کی طرح شاخ کی تاریکیوں سے اُبھرتا ہے اور بادِ نسیم بڑھ کر اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس کے بعد

غنچہ از دستِ گل چیں خوں شود
از چمن مانندِ بو بیروں رود

گل چیں آتا ہے پھول توڑتا ہے۔ اور اس طرح وہی غنچہ، جو وجۂ شادابیٔ گلستاں تھا یوں باغ سے باہر چلا جاتا ہے جیسے خوشبو پھول سے نکل کر پریشان ہو جاتی ہے۔

بست قمری آشیاں، بلبل پرید
قطرۂ شبنم رسید و بو رمید

بلبل جو اس پھول کی شیدائی تھی، اس کے ساتھ ہی باغ سے اُڑ جاتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک پھول کے توڑے جانے اور بلبل کے باغ سے رخصت ہو جانے سے، بہار ختم ہو جاتی اور باغ اُجڑ جاتا ہے؟ نہیں۔ بلبل جاتی ہے تو اس کی جگہ قمری آجاتی ہے۔ پھول سے خوشبو اُڑ جاتی ہے تو اس کی جگہ قطرۂ شبنم لے لیتا ہے جو وجۂ سیرابیٔ شاخساراں بن جاتا ہے۔ لہٰذا

رخصتِ صد لالۂ ناپائیدار
کم نسازد رونقِ فصلِ بہار

ایک خاص وقت تک شگفتہ رہ کر مرجھا جانے والے گلِ لالہ کی پژمردگی سے بہار کی رونق کم نہیں ہو جاتی۔

از زیاں گنجِ فراوانش ہماں
نخلِ گلہائے خنداں‌ش ہماں

اتنے سے نقصان سے بہار کے گنجِ فراواں رہے بہا خزانہ، میں کوئی کمی نہیں آجاتی۔ وہ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اس کی شاخیں جو ہونگی

مسکراہٹ اسی انداز سے نور پاش و عطر بیز دکھائی دیتی ہے۔

فصلِ گل از نسترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است

گل لالہ جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرے پھول لے لیتے ہیں اور باغ کی رونق بدستور باقی رہتی ہے۔ اسی طرح

کانِ گوہر پرورے گوہر گرے
کم نگردد از شکستِ گوہرے

کسی کان میں اگر ایک لعل ٹوٹ جائے تو اس سے کان کی جواہر ریزیوں میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کان، جواہر کی تخلیق اور پرورش میں بدستور مصروف رہتی ہے اور لعل و گوہر انبار در انبار تیار ہوتے رہتے ہیں۔

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت | جامِ صد روز از خمِ ایام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است | دوشہا نوشین گشت و فردا باقی است

ہر صبح، سورج مشرق سے طلوع ہوتا اور شام کو مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن اس سے تسبیحِ ایام میں ایک دانے کی بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ آفتاب خُم کے خُم لنڈھائے چلا جاتا ہے لیکن اس کی صراحی سے ایک قطرہ بھی کم نہیں ہوتا۔ گذرے ہوئے دن زمانے کی چادر میں لپٹتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر نئی صبح اسی آب و تاب سے نمودار ہو جاتی ہے۔

ہمچناں از فرد ہائے بے سپر
ہست تقویمِ اُمم پایندہ تر

اسی طرح افراد یکے بعد دیگرے دُنیا سے اٹھتے جاتے ہیں لیکن قوم بدستور باقی رہتی ہے۔ اقوام کی تقویم (کیلنڈر) کی پابندگی کا راز افراد کی آمد و رفت میں مضمر ہے۔

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است

یہ عجیب کیفیت ہے کہ دوست سفر میں بھی ہے اور شریکِ محفل بھی۔ جا بھی رہا ہے اور موجود بھی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قوم، افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہے۔ لیکن افراد چلتے رہتے ہیں اور قوم موجود رہتی ہے۔ اس لئے کہ

ذاتِ او دیگر صفاتش دیگر است
سنتِ مرگ و حیاتش دیگر است

قوم کی ذات اور صفات، فرد کی ذات و صفات سے مختلف ہے۔ قوم کی موت اور زندگی کا فلسفہ، افراد کی موت و حیات سے الگ ہے۔

فرد بری خیزد از مشتِ گلے
قوم زاید از دلِ صاحب دلے

فرد بیکرِ آب و گِل ہے اس کی پیدائش مٹی سے ہوتی ہے۔ لیکن قوم کی تخلیق اُس تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی (آئیڈیلوجی) کی رہینِ منت ہے جس کی نمود کسی مردِ صاحب دل کے قلب کی گہرائیوں سے ہوتی ہے۔

فرد پور شصت و ہفتاد است و بس
قوم را صد سال مثلِ یک نفس

فرد کی زندگی ساٹھ ستر سال سے زیادہ کیا ہوگی؟ لیکن قوم کی زندگی میں سو سال کا عرصہ بھی ایک سانس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

فرد کی زندگی اس کے جسم کی زندگی سے ہے۔ جب اس پر طبیعی موت آگئی اس کی زندگی ختم ہوگئی۔ لیکن قوم کی زندگی طبیعی توانین (Physical Laws) کے تابع نہیں ہوتی۔ جب تک کوئی قوم ان خصوصیات کی حامل رہتی ہے جن کی بنا پر انہیں عہد گذشتہ میں زندگی اور عروج حاصل ہوا تھا، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مرگ فرد از خشکیٔ رودِ حیات
مرگ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

فرد، سانس کی آمد و شد کے ختم ہو جانے سے مر جاتا ہے۔ لیکن قوم اس وقت مرتی ہے جب وہ اس مقصد کو ترک کر دیتی ہے جس کی خاطر وہ وجود میں آئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ (اگرچہ اقوام کی موت و حیات کا فلسفہ مختلف ہے بایں ہمہ) قومیں بھی ایک نہ ایک دن مر جاتی ہیں۔ لیکن یہ قانون، دنیا کی عام اقوام سے متعلق ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی کیفیت ان سے مختلف ہے۔

گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد
از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

از اجل ایں قوم بے پرواستے
استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے

اُمتِ مسلمہ، رنگ، نسل، زبان یا کسی طبیعیاتی خصوصیت کی بنا پر قوم نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی اساس پر قوم ہے۔ اور یہ آئیڈیالوجی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ قرآن، تمام نوعِ انسانی کے لئے، ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے یہ قوم فنا نا آشنا ہے یہ اجل کی دسترس سے باہر ہے۔

ان اشعار میں "قالوا بلیٰ" سے سورۂ اعراف کی آیت ۷:۱۷۲ کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت کا عام طور پر صوفیا کے کلام میں

حوالہ دیتا ہے جہاں ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی ہستی کا اقرار تمام روحوں سے لیا گیا تھا ألَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ قَالُوا بَلٰى۔ شَهِدْنَا) اس آیت کا صحیح مفہوم کچھ اور ہے لیکن اس کے بیان کرنے کا یہ مقام نہیں۔ علامہ اقبال نے اس آیت کی طرف صرف "ایمان باللہ" کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اشارہ کیا ہے۔

دوسری آیت ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۵) "یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں" مقصود یہ بتانا ہے کہ چونکہ یہ امت حاملِ قرآن ہے اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے رکھا ہے اس لئے یہ قوم بھی دستبردِ اجل سے محفوظ رہے گی۔ یہ قوم سے مراد ہر وہ قوم ہے جو قرآن کی وارث ہے۔ کسی خاص ملک کے مسلمان نہیں اسی کی تائید میں اگلا شعر ہے۔

"تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

قرآن میں ہے يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۹) مخالفین چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہیگا۔ خواہ یہ بات ان مخالفین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ اس سے بھی یہی بیان کرنا مقصود ہے کہ چونکہ وہ آئیڈیالوجی جو اس امت کی تشکیل کی بنیاد ہے فنا نا آشنا ہے اس لئے یہ امت بھی حیاتِ جاوید کی مالک ہے۔

اُمّتے در حق پرستی کاملے
اُمّتے محبوب ہر صاحب دلے

وہ اُمت جو دنیا میں حق کی پرستار ہے اور ہر صاحب دل کے نزدیک محبوب ہے۔

حق برون آورد ایں تیغِ اصیل | از نیام آرزو ہائے خلیل
تا صداقت زندہ گردد از دمش | غیر حق سوزد ز برقِ پیہمش

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ (۲) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہم دونوں کو ایسا بنا دے کہ ہم تیرے احکام کے سامنے سر جھکانے والے ہوں۔ اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حضور سر تسلیم خم کرے" خدا نے حضرت ابراہیم کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کی ذریت سے نبی اکرم کو مبعوث کیا جن کی متبع اُمت مسلمہ کہلائی اور وارث کتاب اللہ بنی۔ اس اُمت کی تشکیل سے مقصد یہ تھا کہ دنیا میں حق و صداقت زندہ رہے اور یہ باطل کے ہر پیکر پر برق خاطف بن کر گرے۔

ما کہ توحید خدا را حجتیم
حافظِ رمز کتاب و حکمتیم

ہم دنیا میں توحید خداوندی کے لئے دلیل و حجت ہیں۔ ہم کتاب و حکمت یعنی وحی منزل من اللہ کے اسرار کے محافظ ہیں۔

آسماں با ما سرِ پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

آسمان کو ہم سے ہمیشہ سے دشمنی رہی ہے اس نے اس مقصد کے لئے وسط ایشیا میں ہلاکو خان کی شکل میں ایک فتنہ کی پرورش کی۔

بندہا از پا کشود آں فتنہ را — بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را
فتنہ پامالِ رہش محشرے — کشتۂ تیغِ نگاہش محشرے
خفتہ صد آشوب در آغوشِ او — صبحِ امروزے نزاید دوشِ او
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید — دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

عباسیوں کی سلطنت کا آخری زمانہ تھا کہ فلکِ ناہنجار نے اس سیلابِ بلا کے بند کھول دیئے اور وہاں سے، شرفِ انسانیت کے ہر آثار کو مٹاتا اور ناموسِ آدمیت کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا، بغداد تک آپہنچا۔ اس تباہی میں اُمتِ مسلمہ کی سطوت و شوکت جس بُری طرح سے لُٹی ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سے ہر چشمِ بینا اس نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ اب مسلمانوں کا دنیا سے نام و نشان مٹ جائے گا۔

تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس
زاں نو آئینِ کہن پندار پرس

لیکن تم ذرا آسمانِ کج رفتار سے پوچھو کہ اس ہلاکت و بربادی کا نتیجہ کیا نکلا؟ بغداد کی خاکستر سے کونسا شعلہ نمودار ہوا؟ اس سے پوچھو کہ

آتشِ تاتاریاں گلزارِ کیست؟
شعلہ ہائے او گلِ دستارِ کیست

اہلِ تاتار کے ہاتھوں جو آگ بھڑکی اس سے کونسی گلزارِ ابراہیمی کی نمود ہوئی؟ یہی تاتاری خود مسلمان ہوئے اور انہی کی سلطنت (سلطنت ترکانِ عثمانی) اسلام کی شوکت و سطوت کا گہوارہ بنی۔

زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمی است — ہم بہ مولےٰ نسبتِ ابراہیمی است
از تہِ آتش بر اندازیم گل — نارِ ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار — چوں بہ باغِ ما رسد گردد بہار

چونکہ اس ملت کی فطرت، فطرتِ ابراہیمی ہے اور خود قرآن نے ہمارے مسلک و مشرب کو ملتِ ابراہیمی کہہ کر پکارا ہے۔ اس لئے

ہم بر اہیمی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ہم ہر نمرود کی آگ کو پھول بنا دیتے ہیں۔ ہم شعلوں سے گلستان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

رومتہ الکبریٰ کی تہذیب و سطوت اُبھری۔ ایک حصۂ دُنیا پر چھا گئی۔ لیکن اب اس کا ذکر صرف تاریخ کے اوراق میں باقی ہے اور بس۔ اسی طرح

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست
رونقِ خمخانۂ یوناں شکست

ایران اور یونان کی تہذیبیں اور سلطنتیں بھی اُبھریں اور ختم ہو گئیں۔

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوانِ او تہِ اہرام ماند

قدیم مصری تہذیب اور شان و شوکت بھی عہدِ پارینہ کی داستان بن کر رہ گئے۔ اب ان کا پتہ نشان بانِ مصر کے مقبروں کے سوا اور کہیں سے نہیں ملتا۔ یہ سب تہذیبیں اُبھریں اور مٹ گئیں۔ لیکن

در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست
ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

دنیا میں اذان کی آواز جس انداز سے پہلے فردوسِ گوش بنتی تھی اسی اسلوب سے آج بھی نشید روح ہے۔ جس طرح اس سے پہلے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا تھا اسی طرح آج بھی وجۂ لرزشِ قلوب ہے۔

عشق آئینِ حیاتِ عالم است — امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ ہست — از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

حقیقت یہ ہے کہ نظامِ کائنات عشق (باہمی کشش) اور حصولِ مقصد کی خاطر تگ و تاز سے قائم ہے۔ اس کے ذرات (Atoms) میں اسی کی وجہ سے ربط و ضبط ہے۔ اور عشق ہمارے دل کی حرارت سے زندہ ہے۔ اس کی تابانیاں آتشِ لا الٰہ کی رہینِ منت ہیں۔ اس لئے

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

اگرچہ ہم دنیا میں بہت مغموم اور دلگیر ہیں۔ بہت خراب و خستہ حال ہیں۔ لیکن ہمارے مرنے سے سارے کے سارے گلستاں کو موت آ جائے گی۔ اگر دنیا میں ملتِ اسلامیہ نہ رہے تو عشق کے ہنگامے سرد پڑ جائیں۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ دنیا رہے اور ملتِ اسلامیہ باقی نہ رہے۔

حقائق و عبر

۱ ۔۔۔ حق و باطل کا معیار

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "میری حدیثوں کے ردّ و قبول کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے قبول کرو اور جو اس سے مخالف نظر آئے اسے رد کر دو" تو آپ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ رسول اللہؐ نے ضرور ایسا فرمایا ہوگا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن کے خلاف کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ جواب آپ ہی کا نہیں ہوگا بلکہ ہر اس شخص کا ہوگا جو قرآن کی تعلیم، سنت نبویؐ کی روح اور حضورؐ کی سیرت طیبہ پر ذرا بھی نگاہ رکھتا ہو۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مولوی صاحبان کی طرف سے اس کا کیا جواب ملے گا؟ سنیئے اور اپنا سر پیٹیئے۔ ارشاد ہے۔

طرفہ یہ ہے کہ ان تمام حقائق و تصریحات کا تو انکار ہے مگر ایک جھوٹی روایت کا سہارا لے کر منکر حدیث ٹولہ یہ کہتا ہے کہ ۔۔۔ "ہم احادیث کے اسی حصے کو قبول کریں گے جو قرآن کریم کے مسائل سے مطابقت رکھتے ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر توضیحات اور اضافوں کو قبول نہیں کریں گے"۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی بات اپنی نہیں بلکہ ان زندیقوں اور ملحدوں کا قول ہے، جنھوں نے سنن نبویہ سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اس مضمون کی ایک روایت ہی گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر لی تھی۔ ۔ جو یہ ہے اِذَا رُوِیَ عَنِّی حَدِیْثٌ فَاعْرِضُوْہُ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ فَاِنْ وَافَقَہٗ فَاقْبَلُوْہُ وَ اِنْ خَالَفَہٗ فَرُدُّوْہُ (تذکرۃ الموضوعات ۲۸) یعنی میری حدیثوں کے رد و قبول کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے موافق ہو اس کو قبول کرو اور جو اس سے مخالف نظر آئے اس کو رد کردو۔ پس اس موضوع روایت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ کوئی بھی مسئلہ کوئی بھی حکم اگر قابل قبول ہے تو صرف اس وقت ہے جبکہ وہ قرآن کے موافق ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب صرف انہیں مضامین و مسائل کو قبول کرنا ہے۔ جو قرآن میں موجود ہیں تو حدیث کی ایسے مضامین و مسائل کے لئے خاص حاجت ہی کیا ہے؟ جب توضیحات و اضافات سے صرف نظر کیا جاتا ہے، تو صرف "موافقات" سے اعتنا کا مطلب؟ "موافقت اور مخالفت"

فضول و لایعنی بحث کو درمیان میں لانا ہی کتاب و سنت میں مغائرت ثابت کرنا ہے۔ حالانکہ ان میں باہم دوئی اور جدائی نہیں ان میں یک جان دو قالب کا رشتہ اور متن و شرح کا تعلق ہے۔

ائمہ حدیث کے اقوال

الغرض اس حدیث کو ملحدین نے وضع کیا تھا اور آج انہی ملحدین کے خیالات کی خوشہ چینی بجواس لازمہ ہے یہ عمران کر رہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں

وَضَعَہُ الزَّنَادِقَۃُ الَّذِیْنَ مَقْصُوْدُھُمْ اِفْسَادُ الدِّیْنِ وَ یَدْفَعُہُ قَوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَ مِثْلَہٗ مَعَہٗ (ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی صفحہ ۳۲۲) یعنی "یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے۔ جس کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کر دینا ہے اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے۔ جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس "حدیث" ہی قرآن کے مانند ہے کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ "قرآن کے مانند" کا نام "حدیث" ہے۔ وہ روایت یہ ہے اَلَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَصِلُ اِلَیْہِ عَنِّی الْحَدِیْثُ فَیَقُوْلُ لَا نَجِدُ ھٰذَا الْحُکْمَ فِی الْقُرْاٰنِ وَ مِثْلُہٗ مَعَہٗ (ظفر الامانی صفحہ ۳۲۶) دوسری حدیث کے یہ لفظ ہیں۔ یُوْشِکُ الرَّجُلُ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یُحَدَّثُ بِحَدِیْثِیْ فَیَقُوْلُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ الحدیث (دارمی صفحہ ۱۴۴ جلد ۱ طبع مصر)

اس قسم کی روایات الکفایہ (ص ۹۔۱۰) میں خطیبؒ نے بھی ذکر کی ہیں۔ جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کے مانند "حدیث" بھی دی گئی ہے۔ امام خطابی کی طرح امام ثانی امام المحدثین عبدالرحمٰن ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنتِ نبویہ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک، منکر الحدیث ہے (مجمع الزوائد جلد اول صفحہ ۱۷۰)

یہ اقتباس ہے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی۔ جھنڈا نگری کے ایک مقالہ کا جو "احادیث نبویہ کی حجیت و حفاظت" کے عنوان سے جمعیت اہل حدیث کے ترجمان، ماہنامہ رحیق کی اپریل ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ جناب رحمانی کی تحقیق انیق۔ اور رحیق کی تائید سے مقصود یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حضورؐ کا وہی قول صحیح ہے جو قرآن کے مطابق ہے، الحاد و زندقہ ہے اور دشمنانِ اسلام کا وضع کردہ نظریہ۔ ہر مومن و متقی کو ایسے فاسق اور باطل خیالات سے محترز رہنا چاہیئے۔

اس کے بعد اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

اے محتسبؔ! اگر قیامت را ندیدی سر ز خاک
سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں

۲۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کے مدیر محمد منظور نعمانی صاحب، جماعت اسلامی کے السابقون الاولون میں سے تھے۔ اس کے بعد وہ جماعت سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے رسالہ کی مارچ۔ اپریل ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں، تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ جماعت اسلامی سے الگ کیوں ہوئے۔ اس طویل مقالہ کے آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جماعت کے پاکستانی حضرات جو جماعت میں بہت بڑی پوزیشن رکھتے تھے، جماعت سے کیوں الگ ہوئے۔ اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:۔

> اب سے تین چار مہینے پہلے (نومبر ۱۹۵۷ء میں) پاکستان جانے کا اتفاق ہوا میں اتنی بات تو پہلے ہی سُن چکا تھا کہ جماعت اسلامی (پاکستان) کے بعض اہم حضرات اس سے الگ ہو گئے ہیں لیکن اس قضیہ کی تفصیل معلوم نہیں تھی۔ وہاں پہنچ کر ذاتی روابط کی بنا پر جماعت اسلامی کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ جماعت سے الگ ہونے والے حضرات میں غازی عبدالجبار صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب میرے اُن پرانے دوستوں میں ہیں جن کو میں نے ہمیشہ بہت صالح، بااخلاص اور مخلص جانا ہے۔ ان دونوں سے بھی ملاقات ہوئی، راولپنڈی میں غازی صاحب سے تو اجمالاً اور لائل پور میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے تفصیلاً معلوم ہوا کہ اس اختلاف اور علیحدگی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ ہم کچھ عرصہ سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ دین کے بارے میں مودودی صاحب زیادہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ اور ان کے سامنے اب مسئلہ صرف اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ جس وقت جو پالیسی اختیار کرنا مناسب سمجھیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں۔ چاہے وہ اسلام کے اصولوں کے کتنے ہی خلاف ہو وہ اس کو اختیار کریں گے اور اسلام ہی کا نام لے کر اختیار کریں گے اور اس کے لئے اگر ضرورت پڑی تو وہ اسلامی اصولوں کی من مانی تشریح کریں گے۔ لیکن ہم لوگ اس کو سخت ضلال اور فتنہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی کہ یہ چیز آگے نہ چلے اور ہم خود مودودی صاحب کو اور جماعت کو اس راستہ پر نہ چلنے دیں۔ لیکن مودودی صاحب اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ایک عرصہ تک اندر کشمکش ہوتی رہی۔ در اصل یہی کشمکش تھی جس کے نتیجہ میں ہمیں جماعت اسلامی سے الگ ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ طلوع اسلام پہلے دن سے یہ کہہ رہا تھا کہ مودودی صاحب کے پیش نظر مقصد صرف اقتدار کا حصول ہے۔ مذہب صرف ایک آلہ یا حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس وقت یہ حضرات طلوع اسلام کی حقیقت بیانی کو (پناہ بخدا) اسلام کے خلاف بغاوت اور (معاذ اللہ) شانِ رسالت کے منافی سمجھتے تھے (کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ مودودی صاحب مزاج شناس رسول ہیں) للہ الحمد کہ اب حقیقت ان پر خود منکشف ہو گئی اور انھیں اقرار کرنا پڑا کہ مذہب کا یہ نقاب محض حصول اقتدار کا ذریعہ تھا۔

کس قدر خطرناک ہیں وہ لوگ جو اپنے مفاد و اقتدار کے حصول کی خاطر خدا اور رسول تک کو بھی (Exploit)

کرنے سے نہیں چوکتے۔

---

۳ — آخری پناہ گاہ | ہندوستان (بھارت) میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے، اس کے متعلق، جمعیۃ العلماء ہند کا ترجمان الجمعیۃ اپنے ایک افتتاحیہ میں (وزیر داخلہ پنڈت پنت کے ایک بیان کے جواب میں) لکھتا ہے۔

ہم وزیر داخلہ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت یہاں بیحد پریشان ہے۔ جب وہ سوچتی ہے کہ اس ملک میں اس کی آنے والی نسلوں کا کیا بنے گا، تو وہ سخت مضطرب و غمگین ہو جاتی ہے۔ حالت یہاں یہ ہو چکی ہے کہ ایک مسلمان نوجوان، خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، تلاشِ روزگار میں مارے مارے پھرتا ہے اور جب اسے پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی تو بیچارہ مجبور ہو کر پاکستان کا رُخ کر لیتا ہے۔ اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

(بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۵ جون)

یہ وہ الجمعیۃ ہے جو تحریکِ پاکستان کے سخت ترین مخالفین میں سے تھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اسے جلی کٹی سنانے میں پیش پیش تھا۔ اب حالات نے اسے اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ ہندوؤں کی محکومی میں مسلمان چین کی نیند سو نہیں سکتا اور وہاں کے ستم رسیدگان کے لئے اگر کوئی جائے پناہ ہو سکتی ہے تو یہی پاکستان کی سرزمین ہے جس کی یہ حضرات اس شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔

کیا پاکستان کے مسلمان اس سے بھی یہ سبق حاصل نہیں کرتے کہ اگر ان کی حماقتوں، خود غرضیوں اور دراز دستیوں سے، خدانخواستہ پاکستان کی مملکت کمزور ہو گئی تو اُن کا اور ان کی آنے والی نسلوں کا کیا حشر ہوگا؟

ہے کوئی جو اس پند بر دیوار سے نصیحت حاصل کرے؟

فردوسِ گم گشتہ

پرویز صاحب کے انتیس مضامین کا مجموعہ جو زندگی کے اہم حقائق پر مشتمل ہیں

قیمت چھ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

باب المراسلات

۱۔ **مریداں می پرانند** محترم عبدالواحد خاں صاحب نے شمس آباد۔ ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) سے ایک طویل مراسلہ ارسال فرمایا ہے جس کے تمہیدی حصّہ کو حذف کر کے، اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام کے فروری کے شمارہ میں فاضل مدیر نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے "جن شاگرد" اور دوسری کرامات، کا ذکر اخبار مدینہ بجنور وغیرہ کا حوالہ دیکر کیا تھا لیکن جمعیتہ العلماء ہند کے شیخ الاسلام نمبر میں جو واقعات و کرامات درج ہیں وہ اخبار مدینہ وغیرہ سے بھی بالاتر ہیں۔ یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ جمعیتہ العلماء ہند دیوبندی خیالات کے علماء پر مشتمل ہے اور دیوبندی حضرات کا شمار متشددین میں ہوتا ہے لیکن تصوف کی برکت کی وجہ سے جمعیتہ العلماء ہند کے سرکاری آرگن روزنامہ الجمعیتہ دہلی نے جو شیخ الاسلام نمبر ۲۵ رجب المرجب سنہ ۱۳۷۸ھ مطابق ۵؍ فروری سنہ ۱۹۵۹ء کو شایع کیا ہے اس میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی اتنی کثیر التعداد کرامتیں درج ہیں کہ ان کا احصاء طلوع اسلام کے محدود صفحات میں ممکن نہیں۔ لہٰذا گلِ حسن کی کثرت اور دامانِ جگہ کی تنگی کے اعتراف کے ساتھ نہ حضرت شیخ الاسلام کے اس تصرف روحانی کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جس نے کوسوں دُور کے ایک جاں بلب مریض کو حیاتِ نو عطا فرمائی اور نہ مسلم جنوں کے شاگرد ہونے کے واقعات کا ذکر کرتا ہوں (معاذ اللہ) بلکہ صرف ان کرامات کا اندراج کرتا ہوں جو حضرت شیخ الاسلام کو (معاذ اللہ) انبیاء علیہم السلام سے بھی بلند ثابت کرتی ہیں۔ ان کرامات کا تذکرہ جو مولانا جمیل الرحمٰن مفتیؔ دارالعلوم دیوبند کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

پہلا واقعہ سنہ ۱۳۵۲ھ کا ہے جبکہ مولانا حسین احمد مدنی نے مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند سے نمازِ مغرب کے بعد دفعتہً وطن واپس جانے کے لئے فرمایا لیکن سلطان الحق صاحب کسی وجہ سے اپنے وطن واپس نہ جا سکے اور تیسرے روز ان کے وطن سے تار آیا کہ ان کے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے۔ گھر پہنچ کر سلطان الحق صاحب کو تحقیق ہوئی کہ جس وقت مولانا حسین احمد مدنی نے سلطان الحق صاحب سے وطن واپس جانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا ٹھیک وہی وقت ان کے لڑکے کی بیماری کی شدت کا تھا۔

دوسرا واقعہ خود مولانا محمد جمیل الرحمٰن پر گزرا ہے یعنی مفتی صاحب، جناب شیخ الاسلام کو اسٹیشن تک پہونچانے کے لئے جا رہے تھے لیکن جب ان لوگوں کا تانگہ تحصیل کے پاس پہنچا جو اسٹیشن سے پون میل کے فاصلے پر واقع ہے تو انھوں نے تانگوں کو ریل کی سواریاں لاتے ہوئے دیکھا اور شیخ الاسلام کی خدمت میں عرض کیا کہ اب اسٹیشن جانا بیکار ہے لیکن شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اپنی سی کوشش کر لینا چاہیئے اور جب تانگہ اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹرین اب تک کھڑی ہے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ انجن دفعتہً خراب ہو گیا تھا جب حضرت شیخ الاسلام ریل میں بیٹھ گئے تو درست ہو گیا۔

سیرت کی کتابوں میں حضرت رسول خدا صلعم کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ آنحضرت صلعم نے دعوت ذوعشیرہ کے موقعہ پر معجزے کے طور پر قلیل کھانے سے کثیر آدمیوں کا پیٹ بھر دیا تھا۔ جمعیۃ العلماء کے علماء عظام نے یہ گوارا نہ کیا کہ حضرت شیخ الاسلام کو اس شرف سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد جمیل الرحمٰن صاحب نے صفحہ ۱۶۱ کے کالم ۲ پر اپنا چشم دید واقعہ درج کیا ہے کہ احمد حسن صاحب مکھیا نے اسّی آدمیوں کا کھانا تیار کروایا لیکن حضرت شیخ الاسلام تین سو مہمانوں کو لے کر مکھیا صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام کھانے کی کمی کی وجہ سے مطلق پریشان نہ ہوئے بلکہ مفتی صاحب کو اپنے ہمراہ کھانے کے پاس لے گئے پلاؤ کی دیگ کا ڈھکنا اٹھایا ایک لقمہ چاول دیگ میں سے نکال کر آدھے کھائے آدھے دیگ میں ڈال دیئے شوربہ کے برتن میں سے کچھ شوربہ لیا کچھ پیا باقی دیگ میں ڈال دیا روٹی کے ڈھیر میں سے ایک لقمہ کھایا مگر اس میں کچھ ڈالا نہیں اور مولانا محمد جمیل الرحمٰن کو حکم دیا کہ میرا رومال لو اور دیگ پر ڈھانک دو تم خود کھانا نکالو مگر کوئی چیز کھلنے نہ پائے اور اس ہدایت کا نتیجہ مولانا محمد جمیل الرحمٰن نے صفحہ ۱۶۲ کے کالم ایک میں ان الفاظ میں سپرد قلم فرمایا ہے کہ "وہی ایک دیگ جو معمولاً ۶۰ افراد کے لئے کافی ہو سکتی تھی اس میں تین سو سے زائد افراد نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور شوربہ روٹی کا پورا سامان یوں ہی بچ رہا۔" کھانے کے متعلق اس کرامت کو حضرت شیخ الاسلام کے داماد حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب حمیدی نے بھی شیخ الاسلام نمبر کے صفحہ ۱۶۳ کے کالم ایک دو میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ۲۰ و ۲۵ مہمانوں کے اندازے سے کھانا تیار کیا گیا تھا لیکن دسترخوان بچھا تو معلوم ہوا کہ مہمان پچاس سے بھی زائد ہیں حضرت شیخ الاسلام دسترخوان میں لپٹی ہوئی روٹی لے کر خود باہر تشریف لے گئے اور اس میں سے روٹی نکال نکال کر سب کو دینا شروع کر دی، جب تمام مہمان کھانے سے فارغ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ دو تین روٹیاں بچ رہی ہیں۔

دوسری مرتبہ پچاس ساٹھ مہمانوں کے اندازے سے پلاؤ پکایا گیا لیکن کھانے کے وقت معلوم ہوا کہ سوا سو کے قریب آدمی ہیں حضرت شیخ الاسلام باورچی خانہ میں ایک مونڈھے پر تشریف فرما ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک کچھ پڑھتے رہے اس کے بعد دیگ کا ڈھکنا کھول کر اس میں سے ایک بوٹی نکالی آدھی تناول فرمائی اور بقیہ اسی میں ڈال کر ڈھکنا بند کر دیا پھر فرمایا کہ دیکھو سارا ڈھکنا نہ کھولنا۔ تھوڑا سا کھول کر نکالتے رہو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تمام مہمان اور سارے گھر والے شکم سیر ہو گئے۔ ڈھکنا ہٹا کر دیکھا تو پھر بھی دیگ میں کچھ بچ رہا تھا۔

مفتی صاحب نے شیخ الاسلام نمبر کے صفحہ ۱۶۲ کے کالم ایک میں اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے

کچھ قبل سہس پور ضلع بجنور میں بڑے پیمانے پر پولیٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی مگر تاریخ انعقاد کی شب میں اچانک زور و شور کی گھٹا اٹھی اور صبح ہوتے ہوتے بارش کے آثار نزدیک ہو گئے اس منظر کو دیکھ کر کانفرنس کے منتظمین گھبرا گئے اور ایک وفد کی شکل میں شیخ الاسلام کی خدمت میں بارش کے التوا کی غرض سے حاضر ہوئے مگر آپ نے کچھ اس طرح فرما کر ٹال دیا کہ آپ لوگ محض اپنی رونق کی خاطر کاشتکاروں کی منہ مانگی مراد کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں اور مجمع ناکام چلا آیا۔ اسی عرصے میں مولانا محمد جمیل الرحمٰن کو ایک برہنہ سر مجذوبانہ ہیئت کے غیر متعارف شخص نے علیحدہ لے جا کر ان الفاظ میں ہدایت کی کہ مولوی حسین احمد صاحب سے کہہ دو کہ اس علاقہ کا صاحب خدمت میں ہوں اگر وہ بارش ہٹوانا چاہتے ہیں تو یہ کام میرے توسط سے ہوگا۔ مولانا محمد جمیل الرحمٰن نے اسی وقت شیخ الاسلام کے خیمہ میں حاضر ہو کر یہ پیغام پہونچایا اور شیخ الاسلام نے بستر استراحت ہی پر سے ایک عجیب پُر جلال انداز میں ارشاد فرمایا کہ جائیے کہہ دیجئے کہ بارش نہیں ہوگی۔ مولانا محمد جمیل الرحمٰن نے اسی وقت باہر آکر ان صاحب خدمت کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ بہر نوع تھوڑی دیر بعد وہ تہہ بہ تہہ بادل چھٹنا شروع ہو گئے۔ آسمان صاف ہو گیا۔ اور جب تک کانفرنس باقی رہی بارش نہیں ہوئی۔

ضلع بجنور کے ان صاحب خدمت کی طرح کے کچھ اقطاب و ابدال کا ذکر مولانا رشید احمد صاحب صدیقی نے بھی شیخ الاسلام نمبر کے صفحہ ۱۴۴ کالم اول میں کیا ہے۔ یعنی تقسیم ہندوستان سے ایک سال چار ماہ قبل شیخ الاسلام نے تقریباً دو بجے شب کو غالباً خواب دیکھنے کے بعد مولانا رشید احمد صدیقی اور چودھری محمد مصطفیٰ انسپکٹر مدارس کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا کہ۔ لو بھائی اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بنگال اور پنجاب بھی تقسیم کر دیا۔

مندرجہ بالا اصحاب خدمت اور اصحاب باطن سے بھی کہیں زیادہ بلند مرتبہ امیر تبلیغ الحاج مولانا محمد یوسف صاحب نے شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۱۴ کے کالم اول میں شیخ الاسلام کو یہ فرما کر عطا کیا ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی بہت سی صفات مرضیہ سے بڑے بڑے حصے نصیب فرمائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے سواد اعظم کے علماء کرام تصوف کی بے پایاں برکات کی وجہ سے نہ صرف بے شمار اصحاب خدمت اور اصحاب باطن کے قائل ہیں بلکہ کس طرح شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کو اللہ تعالیٰ کے صفات مرضیہ کا بھی شریک سمجھتے ہیں؟

۲۔ "آلاء" کا صحیح مفہوم

محترم نصیر شاہ صاحب نے میانوالی سے ذیل کی خط و کتابت بغرض اشاعت ارسال فرمائی ہے:۔

> غالباً "معارف القرآن" جلد اول میں پرویز صاحب نے کسی جگہ "آلاء" کے معنی قدرت کے لکھ دیئے ہیں۔ اس پر مجھے ایک عزیز ترین دوست کا غیظ و غضب سے بھرا ہوا خط موصول ہوا۔ خط اور اس کا جواب افادۂ عام کی خاطر "طلوع اسلام" کے صفحات کی نذر کر رہا ہوں۔ (نصیر)

"........ آپ کے مشورہ پر معارف القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر اس کی تو پہلی جلد نے ہی میرا جی جلا دیا
غضب خدا کا تفسیر بالرائے کی ایسی بھونڈی مثالیں نہ کبھی دیکھیں نہ سُنیں چلتے چلتے ایک لفظ کی طرف اشارہ
کرتا ہوں سُن لیجیئے کہ آپ کے پرویز کیسے کیسے حیلوں سے تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ ایک لفظ ہے آلاءِ
جو سورۂ رحمٰن میں تکرار سے استعمال ہوا۔ سلف سے لے کر خلف تک سب مفسرین اس بات پر
متفق ہیں کہ اس کے معنی نعمت ہیں۔ مگر وہ بے تکلف اس کے معنی قدرت کر دیتے ہیں۔ اب کہیئے کہ ایسی
تفسیر کو اگر جائز رکھا جائے تو قرآن بچوں کا کھیل ہو جاتا ہے کہ جو آئے اسے مروڑ دے ......"

حبیب مکرم۔

آلاء کے تذکرے تو ہوتے ہی رہیں گے پہلے ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور تفسیر بالرائے کے معانی سمجھ لیجیئے۔ تفسیر بالرائے یہ نہیں کہ مفسرین سلف کے متفق علیہ تفسیر سے اختلاف کیا جائے۔ وہ بھی انسان تھے اور ان کو منزہ عن الخطا سمجھنا جائز نہیں ان کے علمی سرمایہ اور تحقیقی کاوشوں سے عقیدتمندانہ فریفتگی رکھتے ہوئے بھی اُنھیں غلطی سے معصوم تصور کر لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور پھر اُن میں بھی تو اختلافِ رائے ہوتا رہا ہے بلکہ بے شمار باتوں میں تو صحابہؓ کبار بھی ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اس صورت میں تو تفسیر بالرائے "سے جو مفہوم آپ نے اخذ کیا ہے وہ ان پر بھی چسپاں ہو سکتا تھا۔ لیکن تفسیر بالرائے کا مطلب آپ کے اخذ کردہ مفہوم سے قطعاً مختلف ہے۔ تفسیر بالرائے یہ ہے کہ کسی آیت یا لفظ کے معانی تو پہلے سے اپنے ذہن میں متعین کر لئے جائیں اور پھر قرآن کی دوسری آیات کو اپنے ذہنی معانی پہنانے کی کوشش کی جائے۔ ایک نظریہ تو پہلے سے قائم کر لیا جائے اور پھر قرآن کے واضح بیانات کو توڑ مروڑ کر اُسی سانچہ میں ڈھال لینے کی کوشش کی جائے۔

اگر آپ لفظ آلاء سے متعلق پرویز صاحب سے وضاحت طلب کرتے تو وہ خود آپ کو بہتر طریق پر مطمئن کر سکتے تھے مگر چونکہ آپ نے مجھے مخاطب کیا ہے (یعنی قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند) تو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا لکھونگا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت میں ایک ایسے مقام پر ہوں جہاں کتابوں کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ اس لئے جو کچھ لکھونگا کچھ اپنے حافظہ پر بھروسہ کر کے اور کچھ چھوٹی موٹی کتابوں کی مدد سے۔ خدا کرے کہ میری بات آپ کے قلب میں اُتر جائے وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

یہ واقعی صحیح ہے کہ مفسرین اور ماہرین لغت کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ آلاء کے معنی نعمت ہیں۔ حتیٰ کہ علامہ زمخشری اور صاحب لسان العرب بھی جن کی عربی دانی مسلّم ہے اسی لکیر کو اپنے قدموں کی رفاقت کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ مگر اس کو

کیا کیجئے کہ اپنا ذہن تقلید کی اِن پامال راہوں پر چلنے کو تیار نہیں ــــــــ آیئے دیکھیں کہ کتاب اللہ جس وقت نازل ہوئی ہے اُس وقت اس کے معانی کیا سمجھے جاتے تھے۔ سب سے پہلے تو صاحب لسان العرب کی اٰلُوگی کا لُغت اُٹھائیے کہ انہوں نے مادہ "نبہ" میں طرفہ کا یہ شعر نقل بھی کیا ہے اور پھر بھی آلاء کے معنی نعمت کرنے پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

كَامِلٌ يَجْمَعُ آلَاءَ الفَتَىٰ
نَبِهٌ سَيِّدُ سَادَاتٍ خِضَمّْ

(ترجمہ) کامل ہیں نوجوانی کی تمام صفات یکجا ہیں۔ وہ بیدار مغز ہے، سرداروں کا سردار ہے اور سخی ہے۔

(لسان العرب ج ۱۷ ص ۴۴۴)

کمیت اپنے گھوڑے کی قصیدہ خوانیوں کے سلسلہ میں کہہ گیا ہے۔

رَضِيتُ آلَاءَ الكُمَيْتِ فَمَنْ يَبِعْ
فَرَسًا فَلَيْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعِ

(ترجمہ) میں کمیت کی خوبیوں پر خوش ہوں تو جو اپنے گھوڑے کو چھوڑنا چاہے وہ چھوڑ دے لیکن ہمارا گھوڑا فروخت نہیں کیا جائے گا۔

(کتاب الاقتضاب البیدالطوسی صفحہ ۳۰۸)

حماسی ولید ابن ادہم کے اقتدار پر اشک برساتا ہوا کہتا ہے۔

إِذَا مَا امْرُؤٌ أَثْنَىٰ بِآلَاءِ مَيِّتٍ
فَلَا يُبْعِدِ اللهُ الوَلِيدَ بْنَ أَدْهَمَا

(ترجمہ) جب کوئی شخص کسی میت کی خوبیاں بیان کرے تو خدا ولید بن ادہم کو دور نہ کرے۔

فضالہ فقر و فاقہ کا تذلل اور اس کے نقائص بیان کرتا ہے۔

وَفِي الفَقْرِ ذُلٌّ لِلرِّقَابِ وَقَلَّمَا
رَأَيْتُ فَقِيرًا غَيْرَ نِكْسٍ مُذَمَّمِ
يُلَامُ وَإِنْ كَانَ الصَّوَابُ بِكَفِّهِ
وَيُحْمَدُ آلَاءُ البَخِيلِ المُدَرْهَمِ

(ترجمہ) فقیری میں انسانوں کے لئے ذلت و عاجزی ہے اور میں نے بہت کم ایسا فقیر دیکھا ہے

جو حالات ونذموم نہ ہو، اس کی ملامت ہی کی جاتی ہے خواہ وہ راستی پر ہی کیوں نہ ہو اور
بخیل سرمایہ دار کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں

(کتاب المعمرین صفحہ)

اگر آپ ذرا اساند تبرعی کریں گے تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس زمانہ میں آلاء قدرت اقتدار کے معنوں میں مستعمل تھا۔ یا پھر قوت اور طاقت کی صفات سے متعلق استعمال ہوتا تھا۔ نابغہ ذبیانی کہتا ہے۔

هُمُ الْمُلُوْكُ وَاَبْنَاءُ الْمُلُوْكِ لَهُمْ
فَضْلٌ عَلَى النَّاسِ فِي الْآلَاءِ وَالنِّعَمِ

(ترجمہ) وہی بادشاہ اور بادشاہ زادے ہیں اور انہیں دوسرے لوگوں پر قدرتوں اور نعمتوں میں فضیلت حاصل ہے۔

اور غالباً یہی شعر ہے جسے آلاء کے غلط معنوں کی سند مانا جاتا ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ آلاء اور نعم مترادفات ہیں حالانکہ مترادفات کو عجمیت جائز رکھتی ہے مگر عربیت اس سے ابا کرتی ہے۔

آلاء کا واحد آلیٰ ہے اور مکسور الاول ہو کر یہ عہد و پیمان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اَبْيَضُ لَا يَرْهَبُ الْهُزَالَ "وَلَا"
يَقْطَعُ رِحْمًا وَلَا يَخُوْنُ "اِلًى"

(ترجمہ) وہ شریف ہے لاغری سے نہیں گھبراتا نہ رشتہ داروں سے قطع تعلق کرتا ہے اور نہ عہد و پیمان میں خیانت کرتا ہے۔

جمع کی صورت میں جب بغیر ممدود آتا ہے تو اس سے ایسا درخت مراد ہوتا ہے جس کا پھل ظاہر میں خوشگوار نظر آتا ہے مگر اصل میں کڑوا ہوتا ہے۔ بشر بن ابی حازم کا شعر ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَدْحَكُمْ بُجَيْرًا
اَبَا لَجَاءٍ كَمَا امْتُدِحَ الْاَلَاءُ

(ترجمہ) جو کچھ تم بجیر کی مدح کرتے ہو وہ ایسی ہی غلط ہے جیسے اس پھل کی تعریف جو دیکھنے میں بھلا اور ذائقہ میں تلخ ہو۔

اب خود قرآن حکیم کی داخلی شہادت لیجئے کہ وہ کن معنوں کی تصدیق کرتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

اُسی نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح کھن کھن بجتی تھی پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے۔ سو اے گروہ جن وانس تم اپنے رب کی کون کونسی .... کے منکر ہو جاؤ گے۔

آپ خود ہی غور فرمایئے کہ خاک اور آگ سے پیدا کرنا کونسی نعمت اور رحمت ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

روئے زمین پر بسنے والے (دنیا میں بسنے والے) فنا ہو جائیں گے اور تیرے رب کی عزت و جلال والی ذات باقی رہ جائے گی۔

اور اس سے پیشتر رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ بھی آگیا ہے انصاف سے کہیئے کہ یہ قدرت و جبروت کا اظہار ہے یا نعمت اور رحمت کا؟

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ

پستی اور بلندی کی ہر چیز اسی کی محتاج ہے اور وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔

اس آیت کے بعد بھی تکرار کی وہی آیت لائی گئی ہے سوچئے کہ یہاں نعمت کا کونسا پہلو بیان کیا گیا۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ.........

اے گروہ جن وانس اگر تم میں قدرت ہے تو دائرۂ ارض و سموٰت سے نکل بھاگو۔ نکلو بھی! مگر اتنی قوت کے بغیر تم کیسے نکل سکتے ہو۔

کہیئے کہ اس دھمکی میں کونسی نعمت پنہاں ہے؟ علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں قائلینِ نعمت کی طرف سے ایک جواب پیش کیا ہے۔ وہ بھی سُن لیجئے اور پھر ذرا اُس کی معقولیت کو بھی پرکھ لیجئے گا۔

"کارخانۂ کائنات سے نکل بھاگنے کی دھمکی میں بھی نعمت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے جن وانس کے درمیان اس باب میں برابر کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اُس کی قدرت کے خلاف کوئی بھی قدم نہیں اُٹھا سکتا۔"

(تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ ص ۷۱، ۷۲)

اور پھر اس کے بعد کی آیات غور سے پڑھیئے جہاں بتایا گیا ہے کہ آگ کے تند شعلے اُنھیں لپیٹ میں لینے کے لئے لپکیں گے اور آسمان پھٹ کر سرخ چمڑے کی طرح لال ہو جائے گا۔ مجرم کرنے والے اپنے حُلیے سے پہچانے جائیں گے اور اُنھیں سر کے بالوں سے پکڑا جائے گا۔ اور پھر جو ساری کی ساری عذاب جہنم کی تفاصیل بیان ہوئی ہیں کیا آپ کسی حقول آدمی سے اُنھیں نعمتوں کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

مفسرین نے بڑی بڑی تاویلیں کی ہیں لیکن دوراز کار تاویلوں میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے۔ کیا نعوذ باللہ کتاب اللہ اس قدر مجمل اور اظہار مدعا سے اتنی قاصر ہے کہ جب تک رازی و زمخشری کی دقیق نکتہ آرائیوں کے صفحات نہ چاٹ لئے جائیں اس کی آیات بے معنی نظر آتی ہیں۔ اور پھر غور کیجئے کہ علامہ رازی بھی خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ کی لاحاصل تاویلات سے اُکتا کر کہہ بیٹھتے ہیں۔

اِنَّ الْآیَۃَ مَذْکُوْرَۃٌ لِبَیَانِ الْقُدْرَۃِ لَا لِبَیَانِ النِّعْمَۃِ

یہ آیت قدرت کے تذکرہ کے لئے ہے نعمت کے لئے نہیں

(تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۳)

علامہ طبری بھی اسی کے قائل ہیں کہ آلاء کے معنی قدرت ہیں نعمت نہیں۔

حدثنا یونس قال اخبرنا ابن وھب قال قال ابن زید فی قولہ "فَبِاَیِّ آلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○ الآلآءُ۔ القُدْرَۃُ فَبِاَیِّ آلاءِ خَلَقَکُمْ کَذَا وَ کَذَا فَبِاَیِّ قُدْرَۃِ اللہِ تُکَذِّبَانِ اَیُّھَا الثَّقَلٰنِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ

مجھ سے یونس نے بیان کیا کہ ابن وہب نے انہیں بتلایا کہ فبای آلاء .... کی تفسیر میں ابن زید کہتے تھے کہ آلاء کے معنی قدرت ہیں۔ یعنی اللہ نے تمہاری اس طرح تخلیق کی تو اے گروہ جن و انس خدا کی کون کونسی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔

(تفسیر ابن جریر جلد ۲۰ صفحہ ۶۵)

آپ کو عربی تفاسیر میں کیوں کھینچے جاؤں۔ آپ نے علامہ شبیر احمد عثمانی کے فوائد دیکھے ہیں اگر ذرا سمجھ کر ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو بیچارے پرویز سے بگڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور وہاں اسی آلاء سے علامہ ندوی جہنم کو شفاخانہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ خط کو خواہ مخواہ کی طوالت دینے سے گھبراتا ہوں اس لئے ان اشارات پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

والسلام

نصیر

معذرت

دفتر کے کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے ڈاک میں بہت ابتری رہی ہے۔ اگر آپ کو کسی خط کا جواب نہ ملا ہو یا کسی ارشاد کی تعمیل نہ ہوئی ہو۔ یا حساب میں غلط فہمی ہوگئی ہو تو براہ کرم ایک خط دوبارہ لکھ دیجئے۔ ہم شکرگذار ہوں گے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی گل برگ کالونی۔ لاہور

نقد و نظر

۱۔ کتاب الصلوٰۃ امام احمد بن حنبلؒ کا نام نامی و اسم گرامی کس نے نہیں سنا؟ آپ اہل السنت والجماعت کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور آپ کی شہرت اور عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ زیرِ نظر کتاب آپ کی تصنیف ہے جس کا اردو ترجمہ، (از شیخ علی جواد صاحب) نور محمد۔ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ شروع میں قریب ستر صفحات میں حضرت امامؒ کے کوائف حیات ہیں اور اس کے بعد قریب اسّی صفحات پر آپ کی کتاب کا ترجمہ۔

امام احمد بن حنبلؒ کا نام سن کر ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ ان کی کتاب میں صلوٰۃ کا فلسفہ۔ اس کے انفرادی و اجتماعی فوائد۔ اسلامی نظام زندگی میں صلوٰۃ کا بلند مقام اور اس کی غایت۔ اور اسی قسم کے دیگر عنوانات سے بحث کی گئی ہوگی۔ لیکن اس میں، ان امور کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کے عنوانات اس قسم کے ہیں۔ مثلاً امام سے سبقت کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ مقتدی سجدہ کرنے کے واسطے نہ جھکیں جب تک امام اپنی پیشانی سجدہ کرنے کے واسطے زمین پر نہ رکھ دے۔ امام اللہ اکبر کو خوب کھینچ کر نہ کہے مقتدی کا رکوع و سجود اور اٹھنا اور جھکنا امام کے ختم کرنے کے بعد ہونا چاہیئے۔ امام صف سیدھی کرلے اور تکبیر اولیٰ کہنے سے پہلے دائیں بائیں منہ پھیر کر دیکھ لے۔ حضرت بلالؓ صفوں کو سیدھا کرتے اور مقتدیوں کی ایڑیوں پر دُرّے مارتے تاکہ وہ لوگ صف سیدھی کریں۔ حدیث شریف میں ہے کہ بعض لوگ ساٹھ برس تک نماز پڑھتے ہیں پھر بھی ان کی نماز نہیں ہوتی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیونکر؟ فرمایا کہ اگر رکوع پوری طرح سے ادا کرتے ہیں تو سجدہ ادا نہیں کرتے اور اگر سجدہ پوری طرح سے ادا کرتے ہیں تو رکوع ادا نہیں کرتے۔

اسی قسم کے عنوانات ہیں جن سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ آخر میں امام صاحب نے فرمایا ہے کہ۔

> اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اجر و ثواب کی نیت سے اس کتاب کی مختلف ممالک میں اشاعت کرے کیونکہ مسلمانوں کو اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے نماز کو ہلکا سمجھ رکھا ہے اور نماز کی توہین کرتے ہیں۔

نماز کے ارکان کا صحیح صحیح طور پر ادا کرنا ضروری ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نماز انہی محسوس ارکان ہی کا تو نام نہیں۔ یہ چیزیں نماز کی ظاہری شکل سے تعلق ہیں۔ اس کی غرض و غایت اور نتائج الصالح، اس کی حقیقی روح ہیں لیکن ان کی طرف اس کتاب میں اشارہ تک نہیں ملتا۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، وہ عباسیوں کا دور تھا۔ اُس دور میں اُمت بڑے بڑے اہم مسائل حیات سے دوچار تھی۔ عجمی تہذیب و تمدن بُری طرح سے ان کے معاشرہ کا جزو بن رہے تھے۔ قدیم مجوس نظریات و معتقدات حسین و جمیل نقابوں میں، صحیح اسلام کی جگہ لے رہے تھے۔ دربار سے لے کر بازار تک سب انہی کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ضرورت تھی کہ دین کی غایت اور صلوٰۃ کے مقصود و منتہیٰ کو سامنے لا کر بتایا جاتا کہ ان میں اور عجمی تصورات حیات میں کیا فرق ہے۔ اور امت مسلمہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اقامتِ صلوٰۃ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں ان مسائل حیات کو اہمیت حاصل نہیں ہوتی اور سارا زور نظری مسائل (مثلاً مسئلہ خلق قرآن) یا ظواہر (مثلاً نماز کے ارکان وغیرہ) پر صرف ہو جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ حقیقی اسلام، جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم کی وساطت سے عطا فرمایا تھا، رفتہ رفتہ غیر اسلامی تصورات و نظریات سے بدل جاتا ہے اور اس عمق و شدت سے بدل جاتا ہے کہ آج اگر کسی مقام سے حقیقی اسلام کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے تو اسے دین کے خلاف سب سے بڑا فتنہ قرار دیا جاتا ہے۔

بہرحال زیر نظر کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ ضرور ہوگا۔ اور وہ یہ کہ یہاں کے اُردو داں طبقہ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے ان جلیل القدر ائمہ کرامؒ کے نزدیک دین کے اہم مسائل کیا تھے اور ان کی کس انداز سے تشریح و توضیح کی جاتی تھی۔ کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ ڈسٹ کور ضرور خوشنما ہے۔

* * *

بستان المحدثین یہ کتاب، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی تصنیف کا اُردو ترجمہ (از مولانا عبد السمیع صاحب) ہے جسے کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب مرحوم نے مشہور محدثین کے کوائف حیات لکھے اور ان کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ سب سے پہلے امام مالکؒ کا تذکرہ ہے جس کے ضمن میں شاہ صاحب نے یہ واقعہ درج فرمایا ہے کہ

> سترہ سال کی عمر میں آپ نے مجلس افادہ تعلیم کی ابتدا فرمائی تھی۔ لوگ یہ نقل کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں مدینہ کی ایک نیک بی بی کی وفات ہوئی۔ جب غسل دینے والی عورت نے اس کو غسل دیا تو اس نیک بخت مردہ عورت کی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا کہ یہ فرج کس قدر زناکار تھی۔ فوراً اس کا ہاتھ فرج پر ایسا چپک گیا ہوا کہ اس کے جدا کرنے کی سب نے کوشش و تدبیر کی مگر فرج سے اس کا ہاتھ جدا نہ ہوا۔ انجام کار اس مشکل کو علماء و فقہا کی خدمت میں پیش کر کے اس کا علاج اور تدبیر دریافت کی۔ سب کے سب اس سے عاجز ہوئے لیکن امام صاحب نے اس راز کی حقیقت کو اپنے ذہن رسا اور کامل فہم سے دریافت کر کے یہ فرمایا کہ اس غسل دینے والی کو

حدِ قذف (یعنی وہ سزا جو شریعت نے زنا کی تہمت لگانے والے کے لئے مقرر فرمائی ہے) لگائی جائے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق جب اس کے اسّی دُرّے لگائے تو ہاتھ فرج سے فوراً جدا ہو گیا۔ امام صاحب کی امامت اور ریاست اسی دن سے راسخ طور پر جاگزیں ہو گئی (صفحہ ۹۱)

مؤطا امام مالکؒ، حدیث کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے مختلف نسخوں میں احادیث کی تعداد مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ

امام مالک نے شروع میں اپنی مؤطا کو دس ہزار احادیث پر مشتمل فرمایا تھا اور اس میں آہستہ آہستہ انتخاب فرماتے رہے۔ آخر اس حد تک پہنچا۔ اور جب تک امام مالک زندہ رہے مؤطا کو مسودہ کرتے رہے۔ اس وجہ سے اس میں نسخ بہت ہوا ہے اور ہر نسخہ کی ترتیب الگ ہے۔ امام صاحب کے شاگردوں نے اپنی اپنی استعداد کے لائق ترتیب دیکر رائج کیا ہے اور حدیثوں میں بھی فی الجملہ تھوڑا سا تفاوت ہے۔ (صفحہ ۲۰)

امام حارث بن ابی اسامہؒ کے تذکرہ کے ضمن میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "معتبر اشخاص کو ان سے فائدہ حاصل کرنے اور ان کی شاگردی میں اس وجہ سے تردد تھا کہ وہ روایت کرنے پر طالب زر ہوتے تھے...... روایت حدیث پر اجرت لینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ محتاج اور عیالدار تھے اور دختران بے شوہر رکھتے تھے۔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ

میری چھ لڑکیاں ہیں ان میں سب سے بڑی کی عمر ۷۰ سال اور سب سے چھوٹی کی ۶۱ سال ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی شادی بھی اس وجہ سے نہیں کی کہ سامانِ جہیز مجھ کو میسر نہیں اور میرا مقصد تونگر کے ساتھ نکاح کرنے کا تھا۔ اور اگر کوئی خواستگار آیا بھی تو وہ فقیر تھا۔ (صفحہ ۵۵)

امام بخاریؒ کے متعلق شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ انھوں نے

چھ لاکھ حدیثوں کے ان ذخیروں میں سے جو ان کے پاس موجود تھا انتخاب شروع کیا۔ جو ان میں صحیح ترین تھیں ان پر اکتفا کیا۔ اور بعض وہ احادیث جو اسی درجہ پر صحیح تھیں ان کو طوالت کے خوف یا کسی دوسرے سبب سے چھوڑ بھی گئے (صفحہ ۱۲۲)

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے تقابل کے ضمن میں لکھتے ہیں

بعض امور میں (امام مسلم کو) امام بخاری پر بھی ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بخاریؒ کی اکثر روایات اہل شام سے بطریق مناولہ ہیں (یعنی ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں خود ان کے مؤلفین سے نہیں سنی گئیں۔) اس لئے ان کے راویوں میں کبھی کبھی امام بخاری سے غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت اور کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے۔ امام بخاری اسے دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ یہ مغالطہ امام مسلم کو پیش نہیں آتا۔ نیز حدیث میں امام بخاری کے تصرفات۔ مثلاً تقدیم و تاخیر حذف و اختصار کی وجہ سے بعض مرتبہ تعقید

پیدا ہو جاتی ہے (صفحہ ۴۹)

امام مسلمؒ کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

ایک روز مجلس مذاکرۂ حدیث میں آپ سے کوئی حدیث پوچھی گئی۔ آپ اس وقت اسے پہچان نہ سکے۔ اپنے مکان پر تشریف لائے اور اپنی کتابوں میں اسے تلاش کرنے لگے۔ کھجوروں کا ایک ٹوکرا ان کے قریب رکھا تھا۔ آپ اسی حالت میں ایک ایک کھجور اس میں سے کھاتے رہے۔ امام مسلمؒ حدیث کی فکر و جستجو میں کچھ ایسے مستغرق رہے کہ حدیث کے ملنے تک تمام کھجوروں کو تناول فرما گئے۔ اور کچھ خبر نہ ہوئی۔ بس یہی زیادہ کھجوریں کھا لینا ان کی موت کا سبب بنا۔ (صفحہ ۸۰ — ۱۷۹)

امام ابو داؤدؒ کے تذکرہ کے ضمن میں تحریر ہے کہ

انھوں نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے کہ میں نے مصر میں ایک لمبی ککڑی دیکھی۔ اس کو ناپا تو وہ تیرہ بالشت تھی۔ اور میں نے ایک ترنج دیکھا جب اس کو کاٹ کر اونٹ پر لادا تو اس کے دونوں حصے نقاروں کی مانند معلوم ہوتے تھے۔ (صفحہ ۱۸۱)

امام نسائیؒ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ "آپ کثیر الجماع تھے۔ چار عورتیں آپ کے نکاح میں تھیں۔ اور ہر ایک کے پاس ایک ایک شب رہتے تھے۔ ان کے علاوہ لونڈیاں بھی موجود تھیں۔" (صفحہ ۱۸۹)

کتاب "الالمام فی احادیث الاحکام" کے مصنف، امام تقی الدین ابن دقیق العید کے خوارق عادات (کرامات) کے سلسلہ میں شاہ صاحب (صفحہ ۲۱۷ پر) تحریر فرماتے ہیں

جب تاتاریوں کا ہنگامہ رونما ہوا اور اُن اشقیاء کی افواج ستم امواج دیارِ شام کی طرف متوجہ ہوئیں تو سلطانی حکم نافذ ہوا کہ علماء جمع ہو کر صحیح بخاری کا ختم کریں۔ اُس کی ایک سیپارہ باقی رہ گئی تھی۔ جس کو جمعہ کے دن کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ ابھی جمعہ نہیں آیا تھا کہ شیخ تقی الدین (ابن دقیق العید) جامع مسجد میں تشریف لائے اور علماء حاضرین سے استفسار فرمایا کہ بخاری کے ختم سے فارغ ہو گئے؟ سب نے عرض کیا کہ ایک دن کا وظیفہ باقی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کو جمعہ کے روز ختم کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مقدمہ فیصل ہو چکا ہے۔ کل عصر کے وقت تاتاری فوج شکست فاش کھا کر لوٹ گئی۔ اور سلطانوں نے فلاں صحرا میں فلاں گاؤں کے متصل انتہائی خوشی و خرمی سے قیام کیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس خبر کو شائع کر دیں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ چند روز کے بعد سلطانی ڈاک سے اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ اور سر مو تفاوت نہ نکلا۔ ایک دن آپ کی مجلس میں کسی شخص نے بے ادبی کی، آپ نے فرمایا کہ تو نے اپنے آپ کو موت کے حوالہ کر دیا۔ اس کلمہ کو تین بار فرمایا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ شخص تین دن کے بعد مر گیا۔ ایک بار اُن کے بھائی کو کسی ظالم امیر نے تکلیف پہنچائی۔ تو آپ نے اُس کے حق میں فرمایا کہ "ہلاک ہو جائے"۔ چنانچہ اسی طرح واقع

ہوا۔ غرض اس قسم کے قصص و حکایات ان کے بارے میں بہت مشہور ہیں۔

یہ کتاب (بستان المحدثین) متوسط سائز کے قریب ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے طباعت۔ کتابت۔ جلد۔ ڈسٹ کور عمدہ۔ قیمت پانچ روپیہ

٭ ٭ ٭

اصح السیر حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی سیرت طیبہ پر مشہور تالیف ہے جسے نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی۔ نے شائع کیا ہے۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ساڑھے چھ سو صفحات۔ طباعت۔ کتابت جلد گوارا۔ قیمت دس روپے۔

حکیم دانا پوری کی یہ کتاب سیرت، ہمارے قدامت پرست طبقہ کے مسلک، خیالات، اور انداز، کی ترجمان ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں انھوں نے ایک باب عقل کی تنقیص اور یورپ کی "مشرکانہ تعلیم" سے متاثر طبقہ کی تحقیر کی نذر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ سیرت سے متعلق روایات پرکھنے کا معیار صرف اسناد ہیں۔ یعنی اگر کسی روایت کی سند قوی ہے تو روایت صحیح ہے، خواہ اس کا متن (مضمون) کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب روایات کی صحت و سقم کا معیار یہ ٹھہرے تو پھر کتاب میں اس قسم کے واقعات کی کیا کمی ہوگی کہ

> مستند روایات سے ثابت ہے کہ اس روز عکاشہ بن محصنؓ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ حضورؐ نے ان کو ایک شاخ درخت کی دی کہ اس سے لڑو۔ انھوں نے اس کو لے کر حرکت دی تو ان کے ہاتھ میں وہ نہایت نفیس تلوار ہو گئی۔ اس سے وہ غزوات میں برابر لڑا کرتے تھے۔ (صفحہ ۱۳۶)

اور اسی معیار کا نتیجہ ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کی روایت کو بھی بڑے دھڑلے اور فخر سے بیان کیا گیا ہے وھو ھذا۔

> کعب بن اشرف یہودی تھا اور حضورؐ کو سخت تکلیف دیتا تھا حضورؐ کی ہجو میں اشعار لکھتا۔ اور صحابہؓ کی عورتوں کو اشعار میں برا بھلا کہتا بدر کے بعد مکہ جاکر قریش کے سامنے اشعار پڑھے جس میں اُن کو خوب بھڑکایا قبائل میں جاکر اُن کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا۔ اس لئے حضورؐ کی مرضی پاکر محمد بن مسلمہؓ۔ عباد بن بشرؓ۔ حارث بن اوسؓ ابو عبیسؓ بن جبر اور ابو نائلہ سلکان بن سلامہؓ اُس کے قتل کے لئے مستعد ہوئے۔ حضورؐ نے ان لوگوں کو اجازت دی۔ اور یہ بھی اجازت دے دی۔ اگر ضرورت ہو تو مخادعت کی گفتگو کر سکتے ہیں۔
>
> جب یہ لوگ چلے تو حضورؐ خود بقیع الغرقد تک اُن کے ساتھ گئے اور رخصت کیا۔ ابو نائلہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو پہلے ابو نائلہ تنہا گئے۔ آواز دی۔ وہ آیا تو انھوں نے ظاہر کیا کہ ہم لوگ رسول اللہ سے منحرف ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خراب اور ذلیل ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ پھر اُنھوں نے اسلام کی وجہ سے اپنی پریشانی کا حال بیان کیا اور خواہش ظاہر کی کہ تم ہمارے ساتھیوں کا سامانِ حرب رہن رکھو اور خوراک کی چیزوں سے امداد کرو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اس طرح ابو نائلہؓ اس کے مکان

ل؎ ابو عبیسؓ بن جبر الاوسی ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اور حبیشؓ بن حذافہ کے درمیان مواخات کرایا تھا۔ ۱۲ منہ

پر اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

جب اس طرح یہ لوگ وہاں پہنچ گئے اور کعب نیچے آیا تو ابو نائلہؓ نے پکڑ لیا اور دوسرے لوگوں نے قتل کیا اور اس کا سر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ آخر رات تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ یہ لوگ پہنچے۔ حارث ابن اوس کو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کی تلوار سے زخم آ گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن لگا دیا فوراً اچھا ہو گیا۔

رات ہی کے وقت یہودیوں میں ہل چل پڑ گئی۔ صبح کے وقت کچھ یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اس طرح کے قتل پر پریشانی کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعب کے اشعار۔ گفتگو اور طرز عمل سے تم لوگ واقف ہو۔ تم لوگ اگر اپنے معاہدہ پر قائم رہو تو تم سے ہم کو کوئی خصومت نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر معاہدہ کی تجدید ہوئی

غور فرمایا آپ نے کہ اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لینے سے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) صحابہؓ اور خود نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے! لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض۔ ان کے پیش نظر تو فقط یہ ہوتا ہے کہ جن راویوں کو ثقہ قرار دیدیا گیا ہے ان پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

اور جس شخص کی غیرت ایمانی اور ناموس رسالت کی عظمت و محبت اسے اس قسم کے واقعات کو صحیح ماننے کی اجازت نہ دے وہ ان حضرات کے نزدیک "منکر حدیث" اور "منکر شانِ رسالت" اور نہ جانے کیا کیا قرار پا کر دین میں فتنہ برپا کر دینے کا موجب ٹھہرایا جاتا ہے! یا للعجب۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اگر اس وقت مسلمانوں کی تمام سلطنتیں مل کر (اور کچھ نہیں تو) سیرت طیبہ کی ایک صحیح کتاب مرتب اور شائع کر دیں تو عالم انسانیت پر ان کا اس قدر احسان ہو جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ انھیں کون بتائے کہ حضورؐ رحمۃ للعالمین کی صحیح سیرت سامنے نہ ہونے سے انسانیت کون کونسی رحمتوں سے محروم ہو رہی ہے!

ضرورت رشتہ

روڈیشیا افریقہ کے ایک تاجر تعلیم یافتہ نوجوان (ماہانہ آمدنی تقریباً ایک ہزار روپیہ) کے لئے رشتہ درکار ہے۔ لڑکی تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، نیک سیرت و قبول صورت ہو۔ مندرجہ ذیل پتہ پر تفصیل سے لکھیں۔

م۔ع۔ معرفت ماہنامہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

کراچی ــــ سے ــــ لاہور

پرویز

"وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد"

ادارۂ طلوع اسلام کی کراچی سے لاہور کی طرف نقل مکانی کے ساتھ خود میرا وہاں سے لاہور آجانا ایک فیصلہ شدہ امر تھا۔ اس لئے اس میں نہ کسی کو کوئی شک ہو سکتا تھا نہ شبہ۔ اس فیصلہ کے اعلان کے بعد میں کافی دنوں تک کراچی میں رہا۔ آخری ایام میں وہاں کے احباب میری نقل مکانی کے سلسلہ میں تمام ضروری امور خود سر انجام دیتے، اور سامان کے باندھنے بندھوانے میں میرے برابر کے شریک رہے۔ اس تمام دوران میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان احباب نے (اور خود میں نے) اس فیصلہ کو اس انداز سے قبول کر لیا ہے کہ اس کا کوئی اثر ہم پر نہیں۔ لیکن جب ۳۰ مارچ (اتوار) کی صبح، درس قرآن کے بعد میں نے اعلان کیا کہ کراچی میں میرا یہ آخری درس ہوگا، تو اس وقت یہ عقدہ کھلا کہ اس تمام دوران میں ہم نے اپنے دل کو (غیر شعوری طور پر) ایک فریب سا دے رکھا تھا، ورنہ وہ مفارقت کے احساس سے، اندر ہی اندر آبگینہ کی طرح پگھلے جا رہا تھا۔ اس اعلان نے اس خود فریبی کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں کے پگھلے ہوئے آبگینے، بلا اختیار آنکھوں کے راستے بہ نکلے۔ مجمع میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کر کے احباب کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن چند ہی فقروں کے بعد خود میرا یہ عالم تھا کہ

تسلی میں بھی تخم غم بو دیئے

وہ سمجھاتے سمجھاتے خود رو دیئے

احباب نے وہیں فیصلہ کیا کہ شام کو افطاری کے لئے...... جمع ہوں گے اور جی کھول کر باتیں کریں گے۔ اس شام کے اجتماع کی یاد کے متعلق مدت تک کہا جائے گا کہ

جلوۂ گل سے خیاباں ہے گذر گاہِ خیال

۲ر اپریل (اتوار) کی شام بزم طلوع اسلام کی طرف سے الوداعی اجتماع کا اہتمام تھا اور اس اجتماع میں احباب کے قلوب میں سوز و گداز کی کیفیات اور بھی شدید ہو چکی تھیں۔ اگرچہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ۳۰ر مارچ کو اعلان کر دیا گیا تھا کہ وہ آخری درس ہو گا۔ لیکن جب احباب کو معلوم ہوا کہ میری روانگی ۱۴ر اپریل (اتوار) کے بعد ہو سکے گی تو انہوں نے اس اتوار کے لئے بھی درس کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہاں کے درس کا سلسلہ ۱۳ر اپریل کے اتوار کو ختم ہوا۔

۱۴ر اپریل کی سہ پہر کو میں وہاں سے چلا۔ احباب نے جس خلوص و محبت اور سوز و گداز سے اسٹیشن پر مجھے الوداع کہا وہ اس حقیقت کا درخشندہ مظاہرہ تھا کہ قرآن کا رشتہ دنیا میں کس قدر حسین اور بے لوث ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ میرے وہاں سے چلے آنے سے ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا واقع ہو گیا جو (بحالات موجودہ) پر نہیں ہو سکتا۔ اسی خلا کا احساس تھا جو انہیں (اور خود مجھے) اس درجہ افسردہ خاطر بنا رہا تھا۔ لیکن ایک بلند مقصد کی خاطر اسے برداشت کرنا تھا۔ سو کیا۔

ان کیفیات کو لئے ہوئے میں نے کراچی کو چھوڑا۔ لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ ان مع العسر یسرا و ان مع العسر یسرا۔ لاہور کے اسٹیشن پر احباب نے جس تپاک اور خلوص۔ جس گرم جوشی اور حرارت قلبی سے میرا استقبال کیا اس سے یہ "شاعرانہ تصور" حقیقت بن کر سامنے آ گیا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

لاہور کے احباب میں البتہ ایک ایسا چہرہ بھی تھا جسے دیکھنے کے لئے نگاہ بیتابانہ ادھر سے اُدھر جاتی تھی لیکن باصد حسرت دیاس کاشانۂ چشم میں واپس آ جاتی تھی۔ ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیر۔ یہ چہرہ تھا ہمارے قدیم اور انتہائی مخلص قرآنی دوست میاں امین الدین مرحوم کا، جن کا انتقال تین چار ماہ قبل ہو چکا تھا۔ (مجھے ان کے جنازہ میں شرکت۔ بلکہ نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت نصیب ہو گئی تھی کیونکہ میں ان دنوں، کلوکیم کے سلسلہ میں لاہور میں تھا) میاں صاحب مرحوم جن خوبیوں کے انسان تھے ان کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے یہ خوبیاں آوارۂ وطن ہو گئیں۔ قرآن سے والہانہ عشق اور اس کے ساتھ یکسر عمل۔ عمل کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگرچہ وہ میری فکری تحریک کے ساتھ بڑی دلچسپی رکھتے تھے لیکن "انفاق فی سبیل اللہ" کے سلسلہ میں جب بھی کچھ دیا ان دو شرطوں کے ساتھ دیا کہ (۱) ان کا نام ظاہر نہ ہونے پائے اور (۲) اس روپے سے صرف ان لوگوں کی امداد کی جائے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو۔ یعنی اس امداد سے انہیں کمانے کے قابل بنا دیا جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس اس قسم کے ضرورتمند اکثر آتے رہتے ہیں۔

بہت جی چاہتا تھا کہ لاہور کے احباب میں میاں صاحب مرحوم بھی موجود ہوتے لیکن اب ان کی یاد ہی وجۂ نشاط روح ہے۔

بہرحال، اس طرح میں کراچی سے لاہور آ گیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، لاہور آنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب مجھ سے اور میں ان سے قریب ہو جاؤں، تاکہ باہمی ربط و مشاورت سے یہ فکری تحریک آگے بڑھے۔

یہ قرب، صرف لاہور کے احباب تک ہی محدود نہیں۔ لاہور ایک مرکز ہے جس کا محیط مغربی پاکستان کا تمام علاقہ ہے۔ لہٰذا اس قرب میں پشاور سے ملتان تک کے تمام احباب شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ لاہور کے احباب پر اس ضمن میں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن دیگر مقامات کے احباب کو یہ سمجھ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیئے کہ یہ فرض کفایہ ہے جس میں اگر ایک مقام کے احباب بھی شریک ہو گئے تو گویا سب کی شرکت ہو گئی۔ یہ انفرادی فریضہ ہے، جس میں ہر ایک کے لئے برابر کی شرکت ضروری ہے۔

بہرکیف میں احباب کے فیصلہ کے مطابق یہاں آ گیا ہوں۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ دیکھیں کہ وہ اپنا فریضہ کس نہج سے ادا کرتے ہیں۔ جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے، میں بہر حیث اپنے کام میں مصروف رہوں گا۔ اس کے بعد احباب جس قدر زیادہ سعی و عمل سے اس میں حصہ لیں گے اتنی جلدی یہ فکر آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ زمانے کے تقاضے کچھ ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ سست روی کے لئے اس دور میں کہیں گنجائش نہیں۔ اس تیز گامی کے دور میں اگر کوئی قوم یا جماعت پاؤں میں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی رک گئی تو زمانے کا ریلہ اُسے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

مجھے امید ہے کہ احباب نے مجھے اپنے ہاں بُلا کر جس ذمہ داری کو اپنے سر لیا ہے وہ اس سے بکمال حسن و خوبی سبکدوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہی اُن کی طرف سے میری "ہمائی" ہو گی۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

پرویز

شعلۂ مستور

معارف القرآن کی وہ جلد جس میں حضرت عیسٰے کے کوائفِ حیات اور اقوام کی موت و حیات کے اصول درج ہیں پریس میں چلی گئی ہے۔ آرڈرز بہت جلد بھیجئے۔ تفصیل آئندہ پرچہ میں۔

ناظمِ ادارۂ طلوع اسلام

۲۵ - بی گلبرگ کالونی - لاہور

رابطۂ باہمی

بزم طلوعِ اسلام اور فرقہ پرستی

لاہور میں کچھ احباب نے کہا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم طلوع اسلام کی قرآنی فکر اور مسلک سے تو متفق ہیں لیکن بزم طلوع اسلام کے ممبر نہیں بننا چاہتے کیونکہ اس سے ہم پارٹی بازی اور فرقہ بندی کے مرتکب ہو جائیں گے۔

اگرچہ ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں مختلف شہروں میں بزم اقبال بنی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص بزمِ اقبال کا ممبر بننے سے کسی خاص پارٹی یا مذہبی فرقہ سے متمسک ہو جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ علامہ اقبال نے ایک خاص فکر۔ ایک پیغام ایک فلسفۂ زندگی پیش کیا جس سے بہت سے لوگ متاثر اور متفق ہوئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس فکر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے اور آگے بڑھانے کے لئے منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک مجلس یا سوسائٹی قائم کی۔ اس کا نام بزمِ اقبال ہے۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں وہ کسی فرقہ یا پارٹی سے متمسک نہیں ہو جاتے۔

بعینہٖ یہی کیفیت بزم طلوع اسلام کی ہے۔ طلوع اسلام کی طرف سے قرآنی فکر پیش کی گئی۔ بہت سے لوگ اس سے متاثر اور متفق ہوئے۔ کچھ احباب نے تجویز کیا کہ اس فکر کو عام کرنے کے لئے اجتماعی کوشش ہونی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے ایک سوسائٹی سی قائم کی گئی جس کا نام بزمِ طلوع اسلام ہے۔ اس بزم کے سامنے، طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سوا کوئی اور مقصد نہیں۔ نہ یہ کسی مذہبی فرقہ سے متعلق ہے نہ سیاسی پارٹی سے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بزم کی رکنیت سے آپ فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے جرم کے مرتکب کس طرح ہو جائیں گے؟ بزمِ طلوع اسلام نہ آپ سے کوئی خاص عقیدہ منواتی ہے نہ ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے لئے اُمت کے متوارث طریقوں میں کسی قسم کی تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ اس قسم کی تبدیلی کا حق ہی کسی فرد کو نہیں دیتی۔ پھر آپ بزم کی رکنیت سے کسی خاص فرقہ کی طرف کس طرح منسوب ہو جائیں گے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح "تین نمازوں اور نو دن کے روزوں" کا افسانہ مخالفین کی طرف سے وضع کر کے طلوع اسلام کے سر تھوپ

دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ خیال بھی انہی لوگوں کا پیدا کردہ ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام ایک مذہبی فرقہ کی نمائندہ ہے۔ اسے اچھی طرح سن لیجئے کہ بزمِ طلوعِ اسلام نہ کوئی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی بنانا چاہتی ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی سے متعلق ہے یہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے اجتماعی کوششوں کا ذریعہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی اور مقصد نہیں۔

۲۔۔ **ایک فتنہ سے آگاہی** | جب کوئی تحریک آگے بڑھتی ہے تو اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اس کے اندر تخریب و انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے ماتھے پر ایسا لکھا نہیں ہوتا اس لئے انہیں تحریک میں داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ بعد میں جب ان کی تخریبی کارروائیوں کا پتہ چلتا ہے تو انھیں تحریک سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی فکری تحریک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس میں بھی انتشار پسند عناصر داخل ہوں گے۔ ان کے داخلہ کے وقت آپ اُنھیں پہچان نہیں سکیں گے۔ البتہ جب ان کی تخریبی کارروائیاں سامنے آئیں گی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات کس نیت سے تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ اس وقت آپ کا اولین فریضہ ہوگا کہ تحریک کو ایسے عناصر سے پاک کیا جائے۔

چونکہ کراچی کو (ادارہ طلوعِ اسلام کے دار القیام ہونے کی وجہ سے) خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے وہاں کی بزم میں ایسے عناصر داخل ہو گئے اور ایک مدت تک اپنے انداز میں تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ جب ان کی یہ حرکات نمایاں طور پر سامنے آگئیں تو انھیں تحریک سے الگ کر دیا گیا۔ الگ ہونے کے بعد ان حضرات نے مخالفت کا عجیب انداز اختیار کیا۔ یعنی انھوں نے اپنے آپ کو "مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام" کے نام سے مشہور کر دیا۔

بزمِ طلوعِ اسلام کوئی رجسٹرڈ باڈی نہیں کہ کوئی شخص یا گروہ یہ نام نہ رکھ سکے۔ اس لئے جو لوگ اخلاقی احساس کو بالائے طاق رکھ کر اپنا نام "بزمِ طلوعِ اسلام" رکھ لیں انھیں قانوناً ایسا کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ کراچی کے ان تخریب پسند حضرات کو کچھ اہمیت حاصل نہیں لیکن چونکہ اُنھوں نے اپنے آپ کو "مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام" کہنا شروع کر دیا تھا اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ باہر کی بزموں کو اس سے آگاہ کر دیا جائے۔ بزموں کو یہ معلوم ہے کہ

(۱) مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام کوئی ہے ہی نہیں۔ اور

(۲) جس بزم کا اعلان طلوعِ اسلام میں نہ کیا جائے اس بزم کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔

لہٰذا آپ صرف انہی بزموں کو مسلّمہ سمجھیں جن کا اعلان طلوعِ اسلام میں ہو چکا ہو۔

---

۳ ۔۔۔ **تحریک کا نیا دور** | ادارہ طلوعِ اسلام کے کراچی سے لاہور منتقل ہو کر آجانے سے تحریک گویا ایک نئے دور

میں داخل ہوئی ہے۔ تحریک کا گہوارہ مغربی پاکستان کا علاقہ ہے۔ ادارہ کے کراچی ہونے سے مغربی پاکستان کی بزمیں ادارہ سے ذاتی ربط وضبط سے محروم تھیں اور یہ چیز تحریک کی ترقی کے راستے میں بڑی حد تک حائل تھی۔ ادارہ کے لاہور آجانے سے مقصد یہ ہے کہ ادارہ اور بزموں کے درمیان رابطہ زیادہ بڑھ جائے اور اس طرح باہمی مشاورت سے تحریک کے فروغ کے لئے تیز تر قدم اٹھائے جائیں۔ اس کی دو تین شکلیں ہیں۔

(۱) انفرادی طور پر بزموں کے ارکان اور ترجمان ادارہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ روابط قائم کریں۔

(۲) محترم پرویز صاحب اور ارکان ادارہ بزموں کی دعوت پر ان کے ہاں جائیں اور اس طرح ذاتی طور پر اس پیغام کو آگے پہنچائیں۔

(۳) بزموں کے نمائندگان اور ترجمانوں کے مشاورتی اجتماعات وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہیں تاکہ باہمی تبادلۂ خیالات سے اس فکر کے عام کرنے کی نئی نئی راہیں سامنے لائی جائیں۔

شق سوم کے سلسلہ میں تجویز کیا جاتا ہے کہ ابتدائی بزموں کے نمائندوں اور ضلع بزموں کے ترجمانوں کا ایک غیر رسمی اجتماع جولائی کے پہلے اتوار (۶ر جولائی) کو ادارۂ طلوع اسلام (لاہور) میں منعقد کیا جائے۔ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جو بزمیں اپنے اپنے نمائندے یا ترجمان بھیج سکتی ہوں وہ ۲۰ر جون تک ناظم ادارہ کو اطلاع دیں۔ اجتماع یک روزہ ہوگا۔ اتوار کا دن اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ شرکائے اجتماع صبح کے وقت پرویز صاحب کے درس قرآن میں بھی شریک ہوسکیں۔

:ــــــــــ:

۴۔ **درس قرآن** تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ محترم پرویز صاحب کا درس قرآن ہے۔ جن حضرات کو اس درس میں شریک ہونے کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ درس عام درسوں سے کس قدر مختلف ہوتا ہے اور اس میں قرآنی حقائق کس قدر نکھرے اور سلجھے ہوئے انداز میں وجہ شادابی قلب ونگاہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ درس، ہر اتوار کی صبح (قریب آٹھ بجے) ادارہ طلوع اسلام کے احاطہ میں منعقد ہوگا۔ (واضح رہے کہ ادارہ کا دفتر خود پرویز صاحب کے مکان ہی کے ایک حصہ میں واقع ہے)۔ لاہور کے احباب تو اس درس میں یقیناً شریک ہوں گے۔ ممکن ہو تو لاہور کے قرب وجوار کے شہروں کے احباب کو بھی اس میں شریک ہونا چاہیئے۔ اس درس کا بدل آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ امید ہے درس کا سلسلہ وسط جون سے شروع ہو جائے گا۔

درس قرآن کے سلسلہ میں یہ تجویز ایک عرصہ سے زیر غور چلی آرہی ہے کہ یہ درس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر لیا جائے اور یہ ٹیپ، بعد ازاں (باری باری) ان بزموں کے پاس بھیجا جائے جہاں ٹیپ ریکارڈر موجود ہوں تاکہ وہاں کے احباب اپنی اپنی جگہ اس درس کو سن سکیں۔ جو بزمیں اس اسکیم میں حصہ لے سکنے کے قابل ہوں وہ ادارہ کو مطلع کریں اور یہ بھی

لکھیں کہ ان کے پاس کون ٹیپ ریکارڈر ہے۔

۵ — لغات القرآن

لاہور پہنچنے کے بعد ادارہ کے سامنے سب سے پہلا کام لغات القرآن اور اس کے ساتھ (یا بعد) مفہوم القرآن کی طباعت ہے۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک، مختلف کاتبوں کے نمونے حاصل کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان کتابوں کی کتابت و طباعت اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہیئے اس لئے کاتبوں کے انتخاب میں خاص احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔ امید ہے اس کے بعد جلد ہی کتابت کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ تجویز یہ ہے کہ بیک وقت تین چار اچھے کاتب اس کام پر متعین کر دیئے جائیں تاکہ وقت کی بچت ہو جائے۔

۶ — انگریزی لٹریچر

اس امر کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر دیگر زبانوں (بالخصوص انگریزی) میں بھی شائع ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے کراچی میں کوشش کی گئی لیکن ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ اب لاہور میں کوشش کی جائے گی۔ خدا کرے یہاں کامیابی ہو جائے۔

۷ — تربیتی مرکز

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، یہ تجویز ایک عرصہ سے ادارہ کے پیش نظر ہے، کہ اگر چند تعلیم یافتہ نوجوان ایسے مل جائیں جو دل و دماغ کی عمدہ صلاحیتوں کے مالک ہوں اور اپنے آپ کو قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دینے کا عزم رکھتے ہوں، تو انھیں ایک دو سال کے لئے محترم پرویز صاحب کے زیرِ تربیت رکھ کر اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اس فکری تحریک کے مبلغ بن جائیں۔ کراچی میں ہمیں اس باب میں بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہاں نہ تو ایسے نوجوان سامنے آئے تھے اور نہ ہی ان کی تربیت کے سلسلہ میں اخراجات کے لئے احباب نے ذمہ لیا تھا۔ اب اس پروگرام کو لاہور میں سامنے رکھا جائے گا۔ دیکھیں، یہاں کی فضا اس پر کس حد تک لبیک کہتی ہے۔

۸ — بزموں کی روئداد

چونکہ یہ پرچہ بڑی عجلت میں مرتب کیا گیا ہے اس لئے اس میں بزموں کی طرف سے آمدہ روئداد شائع نہیں ہو سکی۔ تمام بزموں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی اپنی مکمل روئداد ۲۰ر جون تک ادارہ کے پاس بالضرور بھیج دیں۔

سلیم کے نام

اسلام کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اُن کا مدلل جواب اکیس خطوں میں۔ قیمت چھ روپے رعلاوہ محصول ڈاک۔

بچوں کی تعلیم

گھریلو خوشحالی

اپنا مکان

ملک کی ترقی

وہ خواب جو بچت سے حقیقت بن جاتے ہیں

کہتے ہیں خواب انسان کی دلی خواہشات کے آئینہ دار ہوتے ہیں
انسان جس چیز کی خواہش رکھتا ہے وہی اُسے خواب میں نظر آتی ہے
لیکن بعض خوابوں کو حقیقت بنانے کی تدابیر بھی
ہو سکتی ہیں۔ مثلاً خوش آئند مستقبل، خوشحال خاندان،
صحت مند اور تعلیم یافتہ بچے، ترقی یافتہ ملک۔
ان خوابوں کو حقیقت بنانے کا ذریعہ بچت ہے
آج کی ضرورتوں سے ہر پیسہ جو آپ بچائیں وہ آپ کی
آئندہ مسرتوں کا ضامن ہوگا۔ ہر حیثیت کے
لوگوں کیلئے بچت کی مفید صورتیں موجود ہیں۔

سیونگز ٹکٹ
آپ صرف چار آنے بچا کر سیونگز ٹکٹ خرید سکتے ہیں اور چار چار آنے
کی ان ٹکٹوں سے نیشنل ڈویلپمنٹ سیونگز سرٹیفکیٹ خریدے
جا سکتے ہیں۔
پوسٹ آفس سیونگز بینک
ڈاکخانہ میں صرف دو روپے سے حساب کھولا جا سکتا ہے۔
پوسٹل لائف انشورنس
۲۰ سال کی عمر میں صرف تین روپے تین آنے ماہوار پر ایک ہزار
روپے کی انشورنس پالیسی حاصل کی جا سکتی ہے
نیشنل ڈویلپمنٹ سیونگز سرٹیفکیٹ
(منافع کی بچت پر بھی کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا)۔
حکومت بچت کی ان چاروں اسکیموں کی ضمانت دیتی ہے اور
ان پر کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا

اپنے مستقبل کی حفاظت کے لئے بچت کیجئے

سلسلۂ معارف القرآن

(از پرویز)

قرآنی تعلیمات وتصورات کی وضاحت قرآنی آیات کی بنیاد پر

ابلیس و آدم صفحات ۳۷۶ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت آٹھ روپے

—— مضامین:۔ انسانی تخلیق۔ نظریۂ ارتقا۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ روح۔ وحی۔ رسالت۔

جوئے نور صفحات ۳۰۲۔ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲) مجلد گرد پوش قیمت چھ روپے

—— مضامین:۔ طوفان نوح۔ قوم عاد و ثمود۔ ناقۂ صالح۔ لقمان۔ ابراہیم خلیل اللہ۔ آتش نمرود۔ حضرت اسمٰعیل
اسحاق۔ یعقوب۔ لوط۔ یوسف اور شعیب علیہم السلام۔

برق طور صفحات ۳۲۰ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲) مجلد مع گرد پوش قیمت چھ روپے

—— مضامین:۔ حضرت موسیٰ۔ داستان بنی اسرائیل۔ تورات۔ کلیم اللّٰہی۔ قارون۔ ہامان۔ حقیقت سحر۔ واقعہ خضر۔ سطوت داؤدی و شوکت سلیمانی۔ حضرت ایوب۔ یونس۔ ادریس۔ الیاس۔ ذوالکفل علیہم السلام۔ قوم تبع۔ اصحاب الاخدود والرس والحجر۔ یاجوج و ماجوج۔ ذوالقرنین۔

معراج انسانیت یعنی سیرت نبی اکرم قرآن کے آئینہ میں۔ صفحات ۸۳۲ بڑی تقطیع ۲۹×۲۲ مجلد مع گرد پوش و بکس قیمت بیس روپے

—— مطالب:۔ ظہر الفساد (دنیائے مذاہب۔ دنیائے تہذیب۔ عرب کا حسن و قبح (۵۶ صفحات میں) بشارات۔ طلوع آفتاب۔ قم فانذر۔ آویزش حق و باطل۔ استقامت۔ تشکیل جماعت۔ ہجرت۔ مرکز ملت (تحویل قبلہ) جہاد (چار ابواب میں) سلسلہ غزوات۔ سلسلہ دعوت وارشاد اور تعلیم و تبلیغ۔ اسلامی نظام۔ معجزات۔ معراج۔ درون خانہ (عائلی اور معاشرتی زندگی) تکمیل کار۔ جہانِ نو۔ ختم نبوت۔

انسان نے کیا سوچا؟ (دو ہزار سال میں انسانی فکر کا ماحصل) صفحات ۳۶۸۔ بڑی تقطیع ۲۹×۲۲ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دس روپے

—— مسائل:۔ کائنات کیسے بنی۔ زندگی اور شعور کہاں سے آئے۔ کائنات کا مقصد کیا ہے؟ انسانی زندگی کا مقصود کیا ہے۔ خیر و شر اور مستقل اقدار۔ علم کیسے اور کہاں سے حاصل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں سیاست کا مقام۔ مملکت کا تصور۔ انفرادی ملکیت۔ مغربی تہذیب۔ انسانی فکر کا عجز۔ وغیرہ وغیرہ۔

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

96000

- اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ
- مرنا چھاپ سفید شرٹنگ
- دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ وغیرہ

میسرز علی محمد اسمٰعیل 39A/S مولجی جیٹھا مارکیٹ — کراچی

نیز

اسٹال :- مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ ۔ پرانی نمائش

بندر روڈ ایکس ٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے

داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ ۔ کراچی